جلد ۶۳
عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ
سید ابوالاعلیٰ مودودی

مارچ ۱۹۶۵ء

اسلامی معاشرت پر مستند اور جامع کتب

پردہ

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی

- سوسائٹی میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے؟
- ایک صالح معاشرہ کی تعمیر میں پردہ کی اہمیت۔
- مغرب میں ترکِ پردہ سے پیدا شدہ مسائل اور نقصانات،
- عورت اور مرد کے دائرۂ کار کا تعین۔ ہر خاندان کی ایک ضرورت،

قیمت قسم اعلیٰ ۵/۵۰ روپے سستا ایڈیشن ۲/۵۰ روپے

حقوق الزّوجین

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی

- اسلامی قانونِ ازدواج پر ایک مستند کتاب جس کی عدالتوں میں مانی جاتی ہے۔
- غیر مسلموں کے قوانینِ ازدواج اور اسلامی قوانین کا تقابل:
- پُرسکون خاندانی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک ناگزیر کتاب

آفسٹ کی حسین طباعت۔ قیمت ۲/۲۵ روپے

عورت اسلامی معاشرہ میں

از: مولانا سید جلال الدین انصر عمری

- اسلام کے نظامِ معاشرہ کی مکمل تصویر
- اسلام اور دوسری تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ
- اسلام میں عورت کا صحیح مقام اور دائرۂ کار

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۶ روپے سستا ایڈیشن ۲/۷۵ روپے

سُورۃ الاحزاب

از: سید ابوالاعلیٰ مودودی

- غزوۂ احزاب کا تاریخی پس منظر،
- مسئلۂ ختمِ نبوت پر مفصل بحث۔
- نکاح و طلاق اور پردہ کے ابتدائی احکام

آفسٹ کی حسین طباعت۔ ہدیہ صرف ساڑھے چار روپے

اسلام اور ضبطِ ولادت

(نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن)

- تحریکِ ضبطِ ولادت کا تاریخی و سیاسی پس منظر
- اس کے اخلاقی، تمدنی اور معاشی اثرات کا جائزہ
- مذہبی اور دینی نقطۂ نظر سے اس کی حیثیت۔

آفسٹ کی نفیس طباعت۔ قیمت صرف ۳/- روپے

آپ کیا کریں؟

از: مولانا عبدالحی

- دُنیا کی موجودہ مشکلات اور اُن کا حل۔
- اسلام کی دعوت اور اس کے عملی تقاضے
- خواتین کے لیے اصلاح کا عملی پروگرام

خوبصورت ٹائیٹل۔ قیمت صرف ۱/۴۰ روپیہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۳	مارچ ۱۹۶۳ء	عدد ۱

سالانہ چندہ	دفتر رسالہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵۔اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ، لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ۔لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہمارے ملک میں جس سُرعت کے ساتھ اخلاقی انحطاط آ رہا ہے اور اُس کے نتیجے میں یہاں جس افسوسناک انداز سے انسانی جان اور عزّت و آبرُو کا احترام رخصت ہو رہا ہے، وہ ہر اُس شخص کے لیے انتہائی پریشان کُن ہے جس کے اندر انسانیت کی کوئی معمولی رمق بھی باقی ہے۔ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو قتل و غارت کے متعدد واقعات ملیں گے اور انہیں پڑھنے کے بعد آپ یہ محسوس کریں گے کہ اس سفاکی کے پیچھے کوئی زبردست وجہِ اشتعال کام نہیں کر رہے بلکہ نہایت معمولی معمولی باتوں پر بڑی شقاوتِ قلبی کے ساتھ قیمتی جانوں کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ یُوں نظر آتا ہے کہ ہمارے اس ملک کی بستیاں آدمیت سے خالی ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ درندگی کا راج قائم ہو رہا ہے۔

آپ اس بات کو یکسر نظر انداز کر دیجیے کہ کونسے لوگ اس قتل و غارت کے ذمّہ دار ہیں یا اس کی تہ میں کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ آپ اس سنگین صورتِ حال پر خالص انسانی نقطۂ نظر سے سوچیے کہ کیا یہ بات انسانیت کا کوئی شائبہ بھی اپنے اندر رکھتی ہے کہ ایک غریب اور بے کس انسان کو جو سبزی اور پھل بیچ کر اپنا اور اپنے بیوی بچّوں کا پیٹ پال رہا ہو، محض اس لیے گولی سے ٹھنڈا کر دیا جاتے کہ وہ مال خریدنے والوں سے اپنے مال کے جائز دام کا مطالبہ کرتا ہے یا ایک ذہین اور صاحبِ دل نوجوان کا سینہ صرف اس لیے گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے کہ وہ اپنی ایک رائے رکھتا ہے اور اسے ایمانداری اور جرأت کے ساتھ اُس ایوان میں بیان کرتا ہے جو ملکی معاملات کی تنقیح کے لیے تعمیر کیا گیا ہے، یا ایک ہونہار اور مرنجاں مرنج اخبار نویس کی زندگی کا چراغ

محض اس لیے گُل کر دیا جائے کہ وہ اپنے فرضِ منصبی کی بجا آوری میں بعض ایسے حلقوں سے بھی روابط قائم رکھتا ہے جو کسی وجہ سے حکومت کے معتوب ہیں۔

اسی سلسلہ میں آپ ہر قسم کے گروہی اور سیاسی اختلافات سے بلند ہو کر ذرا اُس ہولناکی کو بھی نگاہ میں لائیں جس کا آغاز کراچی میں عین اُس رات ہوا جو ایک نہایت ہی مقدس اور بابرکت مہینے کی ابتدا تھی۔ اس موقع پر مسلمان غیروں کے نہیں بلکہ اپنوں کے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنے، مسلمان نے مسلمان کا گلا کاٹا، مسلمانوں نے مسلمانوں کے گھر جلائے، مسلمانوں نے اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہولی کھیلی اور ایک دوسرے کے خلاف جبر و تشدّد، ظلم و زیادتی، درندگی اور ہوسناکی کے وہ شرمناک مظاہرے کیے کہ اُن کے تصوّر سے انسان تو کیا درندے بھی کانپ جائیں۔

ان واقعات سے انسانیت کو جو صدمہ پہنچا ہے اُس پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ ذرا اُن بدنصیبوں کی محرومیوں پر بھی غور کریں جو ان سے براہِ راست متاثر ہوئے ہیں۔ غریب پھل فروش کا سارا خاندان تباہ ہو گیا۔ اُس کی محنت مشقت سے گھر کے افراد سامانِ زیست مہیا کرتے تھے۔ اسی کے دم قدم سے گھر کی رونق قائم تھی۔ اس کے رخصت ہو جانے کے بعد اس کے پسماندگان کو جس قسم کے جذباتی خلا اور مالی دشواریوں میں اپنی زندگیاں بسر کرنا ہوں گی، ان کا اندازہ کچھ مشکل نہیں ہے۔ اسی طرح مرحوم ضمیر قریشی کی بیوی، اُن کی ننھی بچی، اُن کے بوڑھے والدین اور اُن کے بہن بھائیوں کو جو زبردست نقصان پہنچا ہے کوئی مؤثر سے مؤثر قرارداد، اور کوئی زوردار سے زوردار بیان بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔

انسانی خون کی یہ ارزانی کسی ہنگامی اور وقتی صورتِ حال کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے کچھ ایسے اسباب ہیں جن پر اس ملک کے حکمرانوں اور تمام بہی خواہوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

کیونکہ اگر اس کا بروقت تدارک نہ کیا گیا تو یہ ملک بڑی سُرعت کے ساتھ تباہی کے راستے پر بڑھتا چلا جائے گا اور چند سالوں میں اس کا انحطاط اس مقام پر پہنچ جائے گا جہاں سے اسے سنبھالا دینا قریب قریب ناممکن ہوگا۔ جو ملک غیر ملکی حملوں اور دشمنوں کی بم باری سے تباہ ہوتا ہے وہ جلد ہی ازسرِنو تعمیر ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کے اندر بسنے والوں کے حوصلے پست نہ ہوں اور اُن میں زندہ رہنے کا جذبہ مضمحل نہ ہو چکا ہو۔ لیکن جس ملک میں انسانیت کا دیوالہ نکل جائے، جہاں ظلم و ستم اور بدمعاشی کا دَور دورہ ہو، جہاں ایک بھائی ہی خود اپنے دوسرے بھائی کے درپئے آزار ہو اور کوئی فرد بھی اپنی جان اور عزت و آبرو کو محفوظ محسوس نہ کرتا ہو، اُس ملک کو قدرتی وسائل و ذرائع کی فراوانیاں اور وسیع منصوبہ بندیاں تباہی سے کسی طرح بھی نہیں بچا سکتیں۔

ملک کے بقا، اس کے استحکام اور اُس کی ترقی کا سارا دارومدار انسانی آبادی پر ہے۔ انسان کے لیے خوراک، لباس، اور دوسری ضروریاتِ زندگی سے کہیں زیادہ اہم اپنی زندگی کے بارے میں اطمینان ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کا اپنی زندگی کی حفاظت کے متعلق اطمینان ہوا اور پانی سے بھی زیادہ ضروری ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ کیونکہ وہ ہوا، پانی اور زندگی کی دوسری ضروریات حاصل کرنے کی صرف اُسی صورت میں خواہش اور کوشش کرے گا، جب کہ وہ جینے کے حق سے محروم نہ ہوگا۔ زندہ رہنے کا یہی بھروسہ اُس کے اندر جدوجہد کی امنگ پیدا کرتا ہے اور وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو ایک خاص نہج اور راستے پر ڈالتا ہے۔ جس شخص کے سر پر ہر وقت ستم کی تلوار لٹکتی رہے اور جسے ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہیں اور جو اپنی زندگی کو ہر آن ظالموں کی دست درازیوں کی زد میں سمجھتا رہے، اُس کی فکری اور ذہنی صلاحیتیں کسی طرح اجاگر نہیں ہو سکتیں۔ مسلسل خوف و ہراس کی کیفیات سے نہ صرف جذبات کے اندر تلخی اور دل کے اندر بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے بلکہ انسان کی ساری قوتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ خصوصاً جب اس خوف اور عدمِ اطمینان کے سامان اُن اطراف سے پیدا ہونے شروع ہو جائیں جنہیں وہ اپنی حفاظت کے زبردست مورچے سمجھتا ہو۔

جو حضرات اس نیم برِاعظم کے گزشتہ چالیس پچاس سال کے حالات پر کچھ بھی نگاہ رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ انگریز نے اپنی ساری خامیوں، کمزوریوں اور خود غرضیوں کے باوجود یہاں امن و امان قائم کر رکھا تھا۔ اُس نے بلاشبہ ملک کو سیاسی لحاظ سے کچلا اور معاشی اعتبار سے تاخت و تاراج کیا، اُس نے معاشرے میں سے بے ضمیر اور خود غرض لوگوں کو بڑی محنت سے تلاش کیا اور پھر انہیں اپنے بھائیوں کا گلا دبانے کے لیے بڑے شرمناک طریقے سے استعمال کیا۔ اُس نے دین اور اخلاق کی بیخ کنی کے لیے ہر انسانیت سوز حربہ استعمال کیا، لیکن ان سب تلخ حقائق کو ملنے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس نے ملک کے انتظام و انصرام میں بڑی دلچسپی لی اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے خاطر خواہ انتظامات کیے۔ چنانچہ آج سے چالیس برس پہلے کے اگر ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے تو اُس میں آپ کو قتل و غارت کے بہت کم واقعات ملیں گے۔

پھر اگر کبھی اس قسم کے چند واقعات ہو بھی جاتے تھے تو اُن کی بڑی تندہی سے تفتیش ہوتی تھی۔ مُجرم اکثر و بیشتر گرفتار کر لیے جاتے اور انہیں اپنے جرائم کی فرار واقعی سزا ملتی جس سے مجرموں کے حوصلے پست ہو جاتے اور وہ آج کی طرح بے خوف ہو کر انسانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہ کر سکتے تھے۔

انگریز کے رخصت ہونے سے چند سال پیشتر ہی ملک کا نظم و نسق کافی حد تک ڈھیلا پڑ گیا اور اس وجہ سے سماج دشمن عناصر کے حوصلے بڑھنے لگے اور انہوں نے لوگوں کو مختلف طریقوں سے ستانا شروع کیا۔

ایک طرف تو ان ناپسندیدہ عناصر کی سرگرمیاں تیزی سے بڑھتی رہیں اور دوسری طرف مسلمانوں اور ہندوؤں اور سکھوں میں اختلافات کی ایک ایسی خلیج حائل ہوتی رہی جس نے بالآخر ایک دوسرے کے خلاف شدید منافرت کی صورت اختیار کر لی۔ غنڈوں نے جذبات کی اس تلخی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی ہی قوم کے ہیرو بن کر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مختلف جتھوں

کی رہنمائی کی۔

پاک و ہند کی تاریخ میں اُس دور سے زیادہ کوئی تاریک دور نہیں ملتا جب ہندوؤں اور مسلمانوں اور سکھوں نے خونخوار لوگوں کی سرکردگی میں اَن گنت بے گناہ اور بے کس انسانوں کو قتل کیا، امن پسند شہریوں کی جائدادیں لُوٹیں اور جلائیں، معصوم اور بیکس عورتوں کی عصمت دری کی اور چھوٹے چھوٹے بچوں تک کو بڑے دردناک طریقے سے قتل کر دیا۔ جن لوگوں نے وہ روح فرسا مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور وہ اپنے پہلو میں پتھر کے بجائے دل رکھتے ہیں اُن کے جسم پر آج بھی اِن حالات کے تصوّر سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

تقسیم سے پہلے کلکتہ، بہار اور دوسرے مقامات پر اور پھر تقسیم کے وقت برعظیم کے مختلف علاقوں میں انسان نے انسان کا جو حشر کیا اُس سے نہ صرف انسانی اقدار کی مٹی پلید ہوئی بلکہ خود انسانی جان کا احترام بالکل ختم ہو کر رہ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنگلوں اور ویرانوں میں وحشی جانور اور درندے تو ایک دوسرے کو گوارا کر رہے ہیں لیکن انسان ایک دوسرے کا دشمن اور اس کے خون کا پیاسا بن چکا ہے اور وہ بالکل معمولی انگیخت پر اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے پر تل جاتا ہے۔

مُلک آزاد ہونے کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں زمامِ کار آئی ان کا یہ فرض تھا کہ انسان کے مُنہ کو انسانی خون کی جو چاٹ لگ گئی ہے اس کی کوئی فکر کی جاتی لیکن تقسیمِ ملک نے جس قسم کے پیچیدہ مسائل اور اُلجھنیں پیدا کر رکھی تھیں انھوں نے بعض فرض شناس اصحابِ اقتدار کو بھی اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا اور آدم خور انسان بڑے مزے اور اطمینان کے ساتھ انسانی خون سے لذت حاصل کرتے رہے۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد رفتہ رفتہ عنانِ اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی جو عوامی تائید و حمایت سے یکسر محروم تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے ناجائز اقتدار کی حفاظت کے لیے جہاں حکومت کی انتظامی مشینری کو بے دریغ استعمال کیا وہاں غنڈوں کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ یہ رجحان اگرچہ تقسیمِ ملک سے پہلے ہی کسی حد تک شروع

ہو چکا تھا لیکن تقسیم کے بعد بتدریج اس خطرناک پالیسی پر عمل درآمد بڑھنا شروع ہوا اور غنڈہ ہماری سیاسی زندگی میں ایک فعّال عنصر کی حیثیت سے آگے بڑھنے لگا۔ ایک مدت سے حالت یہ ہے کہ ایک طرف ملک کا نظم و نسق بالکل درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ حکومت کے کارندے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے بجائے اپنا پورا وقت اور ساری صلاحیتیں برسر اقتدار گروہ کے مفادات کی حفاظت و پاسبانی میں صرف کرتے رہتے ہیں کیونکہ انہی خدمات پر اُن کی ملازمت اور ترقی کا سارا دارومدار ہے۔ دوسری طرف غنڈوں کے اندر اپنی غیر معمولی اہمیت کا شعور بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو معاشرے کے ناپسندیدہ عناصر سمجھنے کے بجائے ملک کی بہت بڑی کارکن بلکہ فیصلہ کُن قوت خیال کرنا شروع کر دیا ہے اور اُن کے دل و دماغ میں یہ زعم پیدا ہو گیا ہے کہ اقتدار کی حفاظت اور اس کے ہاتھوں کی تبدیلی میں انہیں بڑی اہم حیثیت حاصل ہے۔ اُونچے طبقوں میں اُن کی پذیرائی کی وجہ سے اُن کے عزائم بہت بڑھ گئے ہیں اور اُن کی مہمات کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے۔ اب وہ حکومت کے کارکنوں سے بالکل بے خوف ہو کر بے گناہ شہریوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ حکومت ان تلخ حقائق سے پوری طرح واقف ہے لیکن وہ اُن سے اغماض برتنے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ جب ایک اوباش اور بداخلاق آدمی کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے تو اسے لامحالہ چھوٹ دینی پڑتی ہے اور اسے اس امر کا اطمینان دلانا پڑتا ہے کہ جو جرم وہ کرے گا اُس کی اس سے کوئی باز پُرس نہ ہو گی۔ جب غنڈہ گردی کی سرپرستی نظم و آئین کی پاسبان طاقتیں کرنے لگیں تو اس وبا کا انتہائی خطرناک صورت اختیار کرنا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں ہے۔

اس ملک میں قتل و غارت، غنڈہ گردی اور عزت و آبرو پر حملوں کی بڑھتی ہوئی واردات کے بنیادی اسباب میں سب سے بڑا سبب خدا سے بے خوفی اور دین سے بے تعلقی ہے۔ تہذیب و شائستگی، ضبطِ نفس، انسانی جان اور اُس کا احترام پیدا کرنے میں جس قدر خدمت مذہب نے کی ہے کسی اور چیز نے نہیں کی۔ مذہب ہی انسان کے لطیف احساسات کو ابھارتا اور اُس کے اندر رحم

اور شفقت کے احساسات کی آبیاری کرتا ہے۔ انسان جتنا مذہب سے دُور ہو گا اتنا ہی وہ خود غرض، بے رحم اور شقی القلب ہو گا۔ یہ احساس کہ انسان ایک رُوح رکھتا ہے جسے اگر تکلیف پہنچے تو وہ مالک الملک کے دربار میں ظالم کے خلاف فریاد کرتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ جو کچھ ظلم و ستم وہ کر رہا ہے اُسے کوئی علیم و خبیر ذات دیکھ رہی ہے اور اُسے دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد اُس ذات کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہونا ہے۔ یہ درحقیقت ضبطِ نفس کے اہم ترین بنیادی محرکات ہیں لیکن اسے اس ملک کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جائے کہ یہاں قوت و طاقت کے اس لازوال خزانے سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے بلکہ مسلسل ایسے اقدام کیے گئے ہیں جن سے ہماری نئی پود ان تصورات اس سے یکسر بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔

ہمارے معاشرتی ڈھانچے کو جس احمقانہ طریق سے تبدیل کیا جا رہا ہے اُس سے بھی جرائم کی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ مغربی تہذیب کو اندھا دھند مسلّط کرنے کی وجہ سے ہمارے ہاں بہت سی ذہنی اور اخلاقی اُلجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً صبر و قناعت کی جگہ معاشرے میں دولت کی ایک نہ مٹنے والی ہوس اور معیارِ زندگی بلند کرنے کی اندھا دھند فکر نے لے لی ہے اور ہر شخص حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے حدود و قیود سے بالکل آزاد ہو کر اُس کے حصول کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اخلاق کی اس پامالی سے انسانی تعلقات کی تقدیس کو شدید نقصان پہنچا ہے اور انسان انہیں مجروح کرنے میں قطعاً کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ لوٹ کھسوٹ کے اس رجحان نے اپنے حدود اور دوسروں کے حقوق کا احترام تو درکنار، احساس تک ختم کر کے رکھ دیا ہے، کجا کہ کوئی شخص دوسرں کے لیے کوئی ایثار کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی جان اور اُس کی عزّت و آبرُو کے مقابلے میں بے جان سکوں کی قیمت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔

ہم چونکہ مغربی تہذیب کے معمار نہیں بلکہ صرف اس کے نقّال ہیں اس لیے اس کے اندر خیر کے جو پہلو بھی ہیں، انہیں اپنی کم ہمتی کی وجہ سے اپنانے سے قاصر ہیں۔ البتہ اس کی برائیوں کو

ہم بڑی سرعت اور خوشدلی کے ساتھ قبول کر رہے ہیں۔ اہلِ مغرب کی طرح ہم میں نہ تو احساسِ ذمہ داری ہے نہ آئین و قانون اور اجتماعی زندگی کے ضابطوں کا احترام اور نہ اپنے کام اور مقصد کی کوئی گہری لگن ہم نے اگر وہاں سے کچھ لیا بھی ہے تو عریانی، فحاشی، شراب خوری، تنگ اور چست لباس، اخلاق سوز فلمیں اور انسانیت سوز ادب۔ ہمارا نوجوان اس بات کا تو بڑا دلدادہ ہے کہ وہ مغربی نوجوانوں کی طرح رقص و سرود کی مجالس میں بے دھڑک شریک ہو، ٹیڈی لباس پہن کر عورتوں پر آوازے کسے، موٹروں اور سکوٹروں کی چوری کرے اور بنکوں اور بڑے بڑے اداروں پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے عجیب و غریب منصوبے بنائے۔ لیکن اُس کے دل میں یہ جذبہ کبھی موجزن نہیں ہوتا کہ وہ مدرسوں، کالجوں، یونیورسٹی یا کام کاج کے دوسرے مراکز میں اُس انہماک، یکسوئی اور ریاضت کا ثبوت دے جو ہمیں مغربی اداروں، دفاتر اور کارخانوں میں نظر آتی ہے۔ ہماری نئی پود نے مغرب سے جو کچھ لیا ہے اس میں بجز ذہنی اور اخلاقی آوارگی، غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل، ہنگامہ آرائی اور شورش پسندی کے کوئی تعمیری جذبہ نظر نہیں آتا۔ ایک طرف نوجوانوں کے قلب و دماغ میں اس قسم کے خوفناک رجحانات پرورش پا رہے ہیں، اور دوسری طرف فلموں اور جاسوسی ناولوں کے ذریعہ انہیں قتل و غارت، ڈاکہ زنی، اغوا اور پھر ان جرائم کی پاداش سے بچنے کے مختلف گُر سکھائے جاتے ہیں۔ جنہیں آزمانے کے لیے وہ مغرب کے اوباش اور آبرو باختہ لوگوں کی تقلید میں بڑے گھناؤنے جرائم کا بے تکلف ارتکاب کرتے ہیں۔ اخبارات میں جرائم کے جو واقعات ہر روز سامنے آتے ہیں اُن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بیشتر تعداد ایسے مجرموں کی ہے جنہوں نے کہیں دُور دراز علاقوں میں قانون کی آنکھ سے چھپ کر تربیت نہیں پائی ہے بلکہ ہمارے اِن شہروں کے نہایت ہی مہذب اور بارونق حصوں میں قانون کے عین سایہ کے نیچے رہ کر یہ تربیت حاصل کی ہے۔ ان کی ٹریننگ کے لیے ایسے رقص گاہیں، نائٹ کلب، سینما گھر اور اسی قسم کے دوسرے بیشمار مراکز موجود ہیں۔

ہمارے ملک کا معاشرتی نظام جس برق رفتاری سے تبدیل ہو رہا ہے اُس نے عوام کو بالکل

حواس باختہ کر دیا ہے۔ نت نئی تبدیلیاں، اور خصوصاً ایسی تبدیلیاں جو ان کے قومی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں، اُن کی قوتِ فکر اور ان کے انفرادی اور اجتماعی اخلاق کے لیے انتہائی تباہ کُن ثابت ہو رہی ہیں اور ان سے لوگوں کے افکار و جذبات میں بڑا اختلال پیدا ہو گیا ہے۔ اہلِ یورپ کے ہاں اگر تھوڑا بہت ذہنی اور جذباتی سکون باقی ہے تو اس کی بڑی وجہ یونان اور روم کا وہ فلسفہ اور طرزِ فکر ہے جس کی بنیاد پر مغربی تہذیب کا محل تعمیر کیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل غیر معقول اور ناقابل فہم ہے۔ ہم اپنے ملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کو تو مغربی تہذیب کے عین مطابق تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس بات کو یکسر نظر انداز کر رہے ہیں کہ یہ تمدن ایک ایسے مادّی طرزِ فکر کا فطری نتیجہ ہے جس نے مدت ہائے دراز تک مغربی ذہنوں کی آبیاری کی ہے۔ اِس بنا پر اہلِ مغرب اپنے نظامِ حیات اور فکری پس منظر کے درمیان کوئی تصادم نہیں پاتے اور وہ اُس کی جکڑ بندیوں کو بڑی خوشدلی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ مگر پاکستان میں ایک مختلف صورتِ حال درپیش ہے۔ یہاں کے عوام کی عظیم اکثریت کا مزاج بنیادی طور پر اُس نظامِ فکر و عقائد کو قبول نہیں کرتا جو اس کے اوپر زبردستی ٹھونسا جا رہا ہے۔ جو نظام قلب و دماغ کو مطمئن کیے بغیر مسلط کیا جائے گا وہ لوگوں کے لیے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہو گا اور اُسے نافذ کرنے اور قائم رکھنے کے لیے بہت سی ناروا پابندیوں بلکہ شدید جکڑ بندیوں سے کام لینا پڑے گا۔

اس افسوسناک صورتِ حال نے ہمارے عوام کو اپنے مستقبل سے سخت مایوس کر دیا ہے۔ وہ جب سیاسی زندگی کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ جب تعلیمی نظام میں کسی تبدیلی کے آرزو مند ہوتے ہیں تو وہاں انہیں قدم قدم پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ معاشی میدان میں سرمایہ دار بڑے اطمینان کے ساتھ جونک کی طرح ان کا لہو چوستا ہے لیکن وہ اس سے جان نہیں چھڑا سکتے اور اگر کبھی ایسا کرنے کی جسارت بھی کرتے ہیں تو گولیوں سے اُن کی تواضع کی جاتی ہے۔ بے بسی کے اس عالم میں بعض لوگوں کے جذبات بہک کر بالکل غلط سمت اختیار کر لیتے ہیں

اور اُن کے اندر مجرمانہ ذہنیت پرورش پانے لگتی ہے۔

بڑھتے ہوئے جرائم کے ان بنیادی اسباب میں سے بہت سے اسباب ایسے ہیں جن کا تدارک حکومت کی تدبیر کے بغیر نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ بعض ایسی تبدیلیوں کے متقاضی ہیں جو افراد کے بس میں نہیں ہیں۔ لیکن نہ تو سب کچھ حکومت کی تدبیر پر موقوف ہے، اور نہ ہم حکومت کی توجہ فرمائی کے انتظار میں قتل و غارت کی اس گرم بازاری کے خاموش تماشائی بن کر بیٹھے رہ سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے جن لوگوں کو بھی اِس صورتِ حال کی اندیشناکی کا کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی روک تھام کے لیے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں اُس میں کوتاہی نہ کریں۔

اس ضمن میں پہلا قدم یہ ہے کہ ہم عوام الناس کے قلب و دماغ میں اس غیر معمولی احترام کا نقش بٹھائیں جو اسلام انسانی جان کے لیے قائم کرنا چاہتا ہے، تاکہ انہیں اس امر کا احساس ہو کہ انسانی جان کا زیاں کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے بلکہ اپنے لیے ایک بہت بڑے شدید عذاب کو دعوت دینا ہے۔ ہمارے ملک کے عوام کافر نہیں ہیں۔ خدا اور رسول اور آخرت کے منکر نہیں ہو گئے ہیں۔ انہیں صرف غفلت لاحق ہو گئی ہے جسے دُور کرنے کے لیے تذکیر کی ضرورت ہے۔ اِس گئی گزری حالت میں بھی ان کی اصلاح کے لیے اگر کوئی چیز کارگر ہو سکتی ہے تو وہ باہر سے لایا ہُوا کوئی فلسفہ نہیں بلکہ خدا اور اس کے رسول کی تعلیم و ہدایت ہی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قتل کے پہلے واقعہ کا جس انداز سے ذکر فرمایا ہے اُس سے اس جرم کی سنگینی، اس کے مفاسد اور قاتل کی مجرمانہ ذہنیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ	آپ انہیں آدم کے دونوں بیٹوں کا قصہ بے کم و
اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا	کاست سنا دیجیے۔ جب اُن دونوں نے قربانی
وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ	کی تو اُن میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور

قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۔ لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۔ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۔ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا

(المائدہ۔ رکوع ۵)

دوسرے کی نہ کی گئی (اس پر وہ دوسرا) بولا کہ مَیں تجھ کو قتل کر کے رہونگا۔ اس نے جواب دیا اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائیگا تو میں اپنا ہاتھ تجھ پر اٹھانے والا نہیں ہوں کہ تجھے قتل کر ڈالوں۔ مَیں اللہ رب العٰلمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔ آخر کار اس کے نفس نے اُسے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا اور وہ اُسے مار کر اُن لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تاکہ اُسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ (یہ دیکھ کر) وہ بولا، افسوس مجھ پر! مَیں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔ غرض وہ اپنے کیے پر سخت نادم ہُوا۔ اسی باعث ہم نے بنی اسرائیل پر یہ مقرر کر دیا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے ایک انسان کو بچایا اُس نے گویا سارے انسانوں کو بچا لیا۔

ان آیات کے مطالعہ سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قتل کا ارادہ ایک ایسے

بیمار ذہن کے اندر پرورش پاتا ہے جو انسانیت کے پاکیزہ احساسات سے یکسر محروم ہو چکا ہو اور جس کی ذہنیت اس حد تک بگڑ چکی ہو کہ وہ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے اُن لوگوں کی جان کا دشمن بن جائے جو کامیاب اور بامراد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قاتل انسانیت کے مشترک احساسات سے یکسر عاری ہوتا ہے۔ اس کے نفس میں اتنا خبث بھر جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر جھانک کر دیکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ البتہ اُسے اپنے گردوپیش جو لوگ بھلے معلوم ہوتے ہیں انہیں مٹانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کی ذہنیت کا کوئی صحت مند انسان تو مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ یہ مجرمانہ طرزِ فکر وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو باؤلے ہو چکے ہیں۔

اس بیمار ذہنیت کے مقابلے میں ایک صحت مند اور معقول انسان کا رویہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے بھائی کا گلا کاٹنے کے بجائے اُس کی زیادتی کو بڑے صبر و تحمل اور بردباری کے ساتھ برداشت کرتا ہے اور اپنے دشمن کے ارادۂ قتل پر مطلع ہونے اور اُس کے ناپاک عزائم کو جاننے کے باوجود اس غیر انسانی فعل کی اپنی طرف سے ابتدا نہیں کرتا۔ یہاں یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام ہمیں یہ تعلیم نہیں دے رہا کہ ہم خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو قاتل کے حوالے کر دیں، یا ظالمانہ حملہ کی مدافعت سے باز رہیں۔ وہ جو چیز ہمارے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی کہ دشمن گھات میں لگا ہوا ہے، اپنی حفاظت کی فکر تو کرنی چاہیے البتہ اس کے قتل کی فکر نہ کرنی چاہیے اور اس بات کو ترجیح دینی چاہیے کہ ظالمانہ اقدام دوسرے کی طرف سے ہو اور آپ کا دامن ابتداء بالقتل سے بالکل پاک رہے۔ اسی بنا پر بعض اکابر نے خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ کے آخری طرزِ عمل کو اسی آیت کی عملی تفسیر قرار دیا ہے۔ یعنی آپ اقدامِ قتل سے آخر وقت تک اجتناب کرتے رہے۔ اپنا گلا کٹوانا گوارا کر لیا لیکن اس بات کو گوارا نہ کیا کہ کسی مسلمان کے خون سے اُن کے ہاتھ رنگین ہوں۔ مشہور مفسر ابن کثیر نے ایوب سختیانی کا مندرجۂ ذیل قول نقل کیا ہے:

ان اول من اخذ بھذہ الایۃ　　　　امتِ محمدیہ میں سے پہلا شخص جس نے اس آیت

من ھٰذہٖ الامۃ عثمان بن عفان — پر عمل کر کے دکھلایا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے

بعض مترجمین نے انی اخاف ربّ العٰلمین کا ترجمہ کرتے وقت لفظ "کیونکہ" بڑھا دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہابیل اگر قابیل کی اشتعال انگیزی کے باوجود اس کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے اجتناب کرتا رہا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اُس کے مقابلہ میں بزدل اور کمزور تھا اور وہ اس کے خلاف نبرد آزما ہونے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اصل میں جو چیز اُسے اس اقدام سے باز رکھ رہی تھی وہ پروردگارِ عالم کا خوف تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس حقیقت کو یُوں کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا خوف نہ صرف انسان کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے باز رکھتا ہے بلکہ انتہائی پُر آشوب حالات میں بھی اُس کے دماغی توازن کو برقرار رکھنے میں اُس کی معاونت اور دستگیری کرتا ہے اور اُسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دامن کو ظلم سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

اس موقع پر "رب العٰلمین" کے الفاظ بھی بڑے معنی خیز ہیں اور قرآن مجید کے کمالِ بلاغت کو ظاہر کرتے ہیں۔ امام راغب نے مفردات میں الرب کے معنی یہ بیان کیے ہیں: ھو انشاء الشیٔ حالاً فحالاً الی حدّ التمام یعنی رب وہ ہے جو کسی چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حدِ کمال تک پہنچائے۔ ہابیل جب قاتلانہ عزائم رکھنے والے بھائی کے مقابلے میں ہر قسم کے اشتعال سے پروردگارِ عالم کے خوف کا ذکر کرتے ہوئے اجتناب کرتا ہے تو اس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ وہ انسانی زندگی پر ہاتھ ڈال کر اُس نظام سے بغاوت کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا تھا جو رب العالمین نے اپنی مخلوق کے حفظ و بقا اور تدریج و ترقی کے لیے قائم کر رکھا ہے وہ اُس خدائی نظامِ ربوبیت میں مددگار بننا چاہتا ہے جس میں انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اب جو شخص بھی اس مقدس نظام کے خلاف عمل کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے بغاوت کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسی بنا پر سورۃ الفرقان میں شرک کے بعد دوسرے درجے پر جس جرمِ عظیم کا ذکر کیا گیا ہے وہ قتل ہے۔

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا — جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے

اخرو لا یقتلون النفس التی حرم اللہ	اور اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک
الا بالحق (رکوع ۶)	نہیں کرتے ۔

پھر قتلِ مومن کے سلسلے میں تو وعید اس سے بھی زیادہ شدید اور سخت ہے۔ اس کی جسارت کرنے والے کے لیے تو وہی سزا رکھی گئی ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے :

ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزاؤہ	اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے ،
جھنم خلدا فیھا وغضب اللہ علیہ	اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔
ولعنہ واعد لہ عذابا عظیما	اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے
(نساء۔۱۳)	اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

حضور سرورِ کائنات کی بے شمار احادیث انسانی جان کے احترام کی تعلیم و تلقین سے بھری پڑی ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک مرتبہ کبائر کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا:

الشرک باللہ وعقوق الوالدین	بڑے گناہ یہ ہیں : اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک
وقتل النفس وقول الزور۔ (صحیح مسلم۔	ٹھیرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، انسانی جان کو
کتاب الایمان۔ باب الکبائر)	ہلاک کرنا، اور جھوٹ بولنا۔

دوسری حدیث میں قتلِ نفس کو ماں باپ کی نافرمانی سے پہلے، شرک کے متصل بیان فرمایا گیا ہے:

عن انس بن مالک قال ذکر	حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکبائر	صلی اللہ علیہ وسلم نے کبائر کے بارے میں بیان
او سئل عن الکبائر فقال الشرک باللہ	فرمایا یا آپ سے کبائر کے متعلق سوال کیا گیا

وقتل النفس وعقوق الوالدین۔ (صحیح مسلم حوالۂ مذکور)

تو آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، انسان کو قتل کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔

قتلِ ناحق تو خیر بڑی بات ہے، جو شخص اس فعل کے ارتکاب کے متعلق سوچے اور اس کی فکر کرے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضگی کو دعوت دیتا ہے:

عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ابغض الناس الی اللہ ثلثۃ: ملحد فی الحرم ومبتغ فی الاسلام سنۃ الجاھلیۃ ومطلب دم امریٔ بغیر حق لیھریق دمہ (بخاری۔ کتاب الدیات)

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین آدمی سب سے زیادہ مبغوض ہیں۔ ایک وہ جو حرم میں بے اعتدالی کرے (مثلاً خون، خرابہ شکار وغیرہ) دوسرا وہ جو اسلام میں جاہلیت کے طریقے چلانے کی کوشش کرے۔ تیسرا وہ جو کسی انسان کا ناحق خون بہانے کے درپے ہو

مسلمان تو مسلمان، اسلام میں تو اُس کافر کا خون بہانا بھی گناہِ عظیم ہے جس کو اسلامی حکومت میں ذمی کی حیثیت حاصل ہو چکی ہو۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن عبد اللہ ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من قتل نفسا معاھداً لم یرح رائحۃ الجنۃ وان ریحھا یوجد من مسیرۃ اربعین عاماً (بخاری کتاب الدیات)

(حضرت) عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی ایسے شخص کو مار ڈالے جس سے معاہدہ کیا جا چکا ہو وہ بہشت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گا حالانکہ بہشت کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہو جاتی ہے۔

(باقی صفحہ ۶۸ پر)

تفہیم القرآن

الشّوریٰ

(۳)

اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان[۳۴] ہے جسے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے[۳۵] اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے[۳۶] ع جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اُس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اُسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہے[۳۷]۔ ۲ع

---

۳۴ اصل میں لفظ لَطِیْفٌ استعمال ہوا ہے جس کا پورا مفہوم "مہربان" سے ادا نہیں ہوتا۔ اس لفظ میں دو مفہوم شامل ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر بڑی شفقت و عنایت رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بڑی باریک بینی کے ساتھ اُن کی دقیق ترین ضروریات پر بھی نگاہ رکھتا ہے جن تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ اور انہیں اِس طرح پورا کرتا ہے کہ وہ خود بھی محسوس نہیں کرتے کہ ہماری کونسی ضرورت کب کس نے پوری کر دی۔ پھر یہاں بندوں سے مراد محض اہلِ ایمان نہیں، بلکہ تمام بندے ہیں، یعنی اللہ کا یہ لطف اس کے سب بندوں پر عام ہے۔

۳۵ مطلب یہ ہے کہ اِس لُطفِ عام کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سب بندوں کو سب کچھ یکساں دے دیا جائے۔ اگرچہ وہ اپنے خزانوں سے دے سب ہی کو رہا ہے، مگر اِس عطا اور دین میں یکسانیت نہیں ہے کسی کو کوئی چیز دی ہے تو کسی دوسرے کو کوئی اور چیز۔ کسی کو ایک چیز زیادہ دی ہے تو کسی اور کو کوئی دوسری چیز فراوانی کے ساتھ عطا فرمادی ہے۔

۳۶ یعنی اس کی عطا و بخشش کا یہ نظام اس کے اپنے زور پر قائم ہے۔ کسی کا یہ بل بوتا نہیں ہے کہ اسے بدل سکے، یا زبردستی اس سے کچھ لے سکے، یا کسی کو دینے سے اُس کو روک سکے۔

۳۷؎ گزشتہ آیت میں دو حقیقتیں بیان کی گئی تھیں جن کا مشاہدہ ہم ہر وقت ہر طرف کر رہے ہیں ایک یہ کہ تمام بندوں پر اللہ کا لُطف عام ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی عطا و بخشش اور رزق رسانی سب کے لیے یکساں نہیں ہے بلکہ اُس میں فرق و تفاوت پایا جاتا ہے۔ اب اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اس لُطف اور رزق رسانی میں جزوی تفاوت تو بے شمار ہیں، مگر ایک بہت بڑا اصولی تفاوت بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آخرت کے طالب کے لیے ایک طرح کا رزق ہے اور دنیا کے طالب کے لیے دوسری طرح کا رزق۔

یہ ایک بڑی اہم حقیقت ہے جسے اِن مختصر الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے پوری تفصیل کے ساتھ سمجھ لیا جائے، کیونکہ یہ ہر انسان کو اپنا رویّہ متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔

آخرت اور دنیا، دونوں کے لیے سعی و عمل کرنے والوں کو اس آیت میں کسان سے تشبیہ دی گئی ہے جو زمین تیار کرنے سے لے کر فصل کے تیار ہونے تک مسلسل عرق ریزی اور جاں فشانی کرتا ہے، اور یہ ساری محنتیں اس غرض کے لیے کرتا ہے کہ اپنی کھیتی میں جو بیج وہ بو رہا ہے اس کی فصل کاٹے اور اس کے پھل سے متمتع ہو۔ لیکن نیت اور مقصد کے فرق، اور بہت بڑی حد تک طرزِ عمل کے فرق سے بھی، آخرت کی کھیتی بونے والے کسان اور دنیا کی کھیتی بونے والے کسان کے درمیان فرقِ عظیم واقع ہو جاتا ہے، اس لیے دونوں کی محنتوں کے نتائج و ثمرات بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف رکھے ہیں، حالانکہ دونوں کے کام کرنے کی جگہ یہی زمین ہے۔

آخرت کی کھیتی بونے والے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ دنیا اسے نہیں ملے گی۔ دنیا تو کم یا زیادہ بہر حال اس کو ملنی ہی ہے، کیونکہ یہاں اللہ جلّ شانہٗ کے لُطفِ عام میں اس کا بھی حصّہ ہے اور رزق نیک و بد سبھی کو یہاں مل رہا ہے۔ لیکن اللہ نے اُسے خوشخبری دنیا ملنے کی نہیں بلکہ اس بات کی سنائی ہے کہ اس کی آخرت کی کھیتی بڑھائی جائے گی، کیونکہ اُسی کا وہ طالب ہے اور اُسی کے انجام کی اُسے فکر لاحق ہے۔ اِس کھیتی کے بڑھائے جانے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ مثلاً جس قدر زیادہ نیک نیتی کے ساتھ وہ آخرت کے لیے عملِ صالح کرتا جائے گا اُسے اور زیادہ نیک عمل کی توفیق عطا کی جائے گی اور اس کا سینہ نیکیوں کے لیے کھول دیا جائے گا۔ پاک مقصد کے لیے پاک ذرائع اختیار کرنے کا جب وہ تہیّہ کرے گا تو اس کے لیے پاک ہی ذرائع میں برکت دی جائے گی اور اللہ اس کی نوبت نہ آنے دیگا کہ اس کے لیے خیر کے سارے دروازے

کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنہوں نے اِن کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اِذن نہیں دیا؟[۳۸] **اگر فیصلے کی بات پہلے طے نہ ہو گئی**

بند ہو کر صرف شر ہی کے دروازے کھلے رہ جائیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ دنیا میں اس کی تھوڑی نیکی بھی آخرت میں کم از کم دس گنی تو بڑھائی ہی جائے گی، اور زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے، ہزاروں لاکھوں گنی بھی اللہ جس کے لیے چاہے گا بڑھا دے گا۔

رہا دنیا کی کھیتی بونے والا، یعنی وہ شخص جو آخرت نہیں چاہتا اور سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے اس کی محنت کے دو نتائج صاف صاف سنا دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ خواہ وہ کتنا ہی سر مارے، جس قدر دنیا وہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ پوری کی پوری اسے نہیں مل جائے گی، بلکہ اس کا ایک حصہ ہی ملے گا جتنا اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے جو کچھ ملنا ہے بس دنیا ہی میں مل جائیگا۔ آخرت کی بھلائیوں میں اس کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔

۳۸؎ اس آیت میں شُرَکَاء سے مراد، ظاہر بات ہے کہ وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں، یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، یا جن کے آگے پُوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ بلکہ لامحالہ اُن سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے، جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اخلاقی اصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور ضابطوں کو اپنے مذہبی مراسم اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدّن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں میں، اور اپنی سیاست اور حکومت میں اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی ان کو کرنی چاہیے۔ یہ ایک پورا کا پورا دین ہے جو اللہ رب العالمین کی تشریع کے خلاف، اور اس کے اذن (SANCION) کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے ایجاد کیا اور ماننے والوں نے مان لیا۔ اور یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل ص ۱۴۴، ۱۹۹، ۲۶۲۔)

ہوتی تو ان کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا[۳۹]۔ یقیناً اِن ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اُس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہونگے اور وہ اِن پر آ کر رہے گا۔ بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لے آتے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ جنت کے گلستانوں میں ہونگے، جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے، یہی بڑا فضل ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے اُن بندوں کو دیتا ہے جنہوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے۔ اے نبی، اِن لوگوں سے کہدو کہ میں اِس کام پر[۴۰] تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں[۴۱]۔

۳۶۶-۳۶۷-۴۳۷-۴۳۸-۴۹۸-۴۹۹-۵۷۷-۵۷۸-۵۸۵-۵۸۶-جلد دوم، ص ۱۸۹-۱۹۰-۲۹۲ تا ۲۹۴-۴۸۲-۴۸۳-۵۷۷-۵۷۸-جلد سوم، ص ۲۱-۶۹-۶۵۶-جلد چہارم، سبا، آیت ۴۱ حاشیہ ۶۳-یٰسٓ، آیت ۶۰-حاشیہ ۵۳)۔

۳۹ یعنی اللہ کے مقابلہ میں یہ ایسی سخت جسارت ہے کہ اگر فیصلہ قیامت پر نہ اٹھا رکھا گیا ہوتا تو دنیا ہی میں ہر اُس شخص پر عذاب نازل کر دیا جاتا جس نے اللہ کا بندہ ہوتے ہوئے، اللہ کی زمین پر خود اپنا دین جاری کیا، اور وہ سب لوگ بھی تباہ کر دیئے جاتے جنہوں نے اللہ کے دین کو چھوڑ کر دوسروں کے بنائے ہوئے دین کو قبول کیا۔

۴۰ اِس کام سے مراد وہ کوشش ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خدا کے عذاب سے بچانے اور جنت کی بشارت کا مستحق بنانے کے لیے کر رہے تھے۔

۴۱ اصل الفاظ ہیں اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی یعنی میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا مگر "قُربٰی" کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔ اس لفظ "قُربٰی" کی تفسیر میں مفسّرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے:

ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنی میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "میں تم سے اِس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی اہلِ قریش) کم ازکم اُس رشتہ داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تُل گئے ہو"۔ یہ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے حوالہ سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور ابن سعد وغیرہم نے نقل کیا ہے، اور یہی تفسیر مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سدّی، ابو مالک، عبدالرحمان بن زید بن اسلم، ضحاک، عطاء بن دینار اور دوسرے اکابر مفسّرین نے بھی بیان کی ہے۔

دوسرا گروہ "قربیٰ" کو قرب اور تقرب کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر اللہ کے قرب کی چاہت پیدا ہو جائے" یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ، بس یہی میرا اجر ہے۔ یہ تفسیر حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے، اور ایک قول قتادہ سے بھی اس کی تائید میں نقل ہوا ہے بلکہ طبرانی کی ایک روایت میں ابن عباسؓ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہی مضمون ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (الفرقان-۵۷)۔ "ان سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا، میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔"

تیسرا گروہ "قربیٰ" کو اقارب (رشتہ داروں) کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبت کرو۔" پھر اس گروہ کے بعض حضرات اقارب سے تمام بنی عبدالمطلب مراد لیتے ہیں، اور بعض اسے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر سعید بن جبیر اور عمرو بن شعیب سے منقول ہے، اور بعض روایات میں یہی تفسیر ابن عباسؓ اور حضرت علی بن حسین (زین العابدینؒ) کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن متعدد وجوہ سے یہ تفسیر کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو جس وقت مکہ معظمہ میں سورۂ شوریٰ نازل ہوئی ہے اُس وقت حضرت علیؓ و فاطمہؓ کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اولاد کا کیا سوال۔ اور بنی عبدالمطلب میں سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، بلکہ اُن میں سے بعض کھلّم کھلا دشمنوں کے ساتھی تھے، اور ابولہب کی عداوت کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمطلب ہی نہ تھے۔ آپؐ کی والدہ ماجدہ، آپؐ کے والد ماجد اور آپؐ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہؓ کے واسطے

جو کوئی بھلائی کمائے گا ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے ۔ بے شک اللہ

سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپ کی رشتہ داریاں تھیں ۔ اور ان سب گھرانوں میں آپ کے بہترین صحابی بھی تھے اور بدترین دشمن بھی ۔ آخر حضور کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان سب اقربا میں سے آپ صرف بنی عبدالمطلب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس مطالبۂ محبت کو انہی کے لیے مخصوص رکھتے ۔ تیسری بات ، جو ان سب سے زیادہ اہم ہے ، وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے ، اُس مقام سے اِس کارِ عظیم پر یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو ، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم اِس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہو گی اور نبی نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہو گی ۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصّے آئے ہیں اُن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی اٹھ کر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا ، میرا اجر تو اللہ رب العٰلمین کے ذمّہ ہے (یونس ۷۲ ۔ ہود ۲۹ ۔ ۵۱ ۔ الشعراء ۱۰۹ ۔ ۱۲۷ ۔ ۱۴۵ ۔ ۱۶۴ ۔ ۱۸۰) ۔

سورۂ یٰس میں نبی کی صداقت جانچنے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے (آیت ۲۱) ۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے قرآنِ پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ مَیں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں (الانعام ۹۰ ۔ یوسف ۱۰۴ ۔ المومنون ۷۲ ۔ الفرقان ۵۷ ۔ سبا ۴۷ ۔ ص ۸۶ ۔ الطور ۴۰ ۔ القلم ۴۶) ۔ اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع ہے کہ مَیں اللہ کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں اِس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو ۔ پھر یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اِس تقریر کے مخاطب اہلِ ایمان نہیں بلکہ کفّار ہیں ۔ اوپر سے ساری تقریر انہی سے خطاب کرتے ہوئے ہوتی چلی آ رہی ہے ، اور آگے بھی روئے سخن انہی کی طرف ہے ۔ اِس سلسلۂ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا آخر سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ۔ اجر تو اُن لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اُس کام کی کوئی قدر ہو جو کسی شخص نے اُن کے لیے انجام دیا ہو ۔ کفّار حضورؐ کے اِس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپ ان سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو مَیں نے تمہاری انجام دی ہے اس پر تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرنا ۔ وہ تو اُلٹا اسے جرم سمجھ رہے تھے اور اُس کی بنا پر آپ کی جان کے درپے تھے ۔

بڑا درگزر کرنے والا اور قدردان ہے[۴۲]۔

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے[۴۳]؟ اگر اللہ چاہے تو تمہارے دل پر مُہر کر دے[۴۴]۔ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے[۴۵]۔ وہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے[۴۶]۔ وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے

۴۲؎ یعنی جان بوجھ کر نافرمانی کرنے والے مجرمین کے برعکس نیکی کی کوشش کرنے والے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ (۱) جتنی کچھ اپنی طرف سے وہ نیک بننے کی سعی کرتے ہیں، اللہ ان کو اس سے زیادہ نیک بنا دیتا ہے (۲)، ان کے کام میں جو کوتاہیاں رہ جاتی ہیں، یا نیک بننے کی کوشش کے باوجود جو گناہ ان سے سرزد ہو جاتے ہیں، اللہ ان سے چشم پوشی کرتا ہے، اور (۳) جو تھوڑی سی نیک عمل کی پُونجی وہ لے کر آتے ہیں اللہ اس پر ان کی قدر افزائی کرتا ہے اور انہیں زیادہ اجر عطا فرماتا ہے۔

۴۳؎ اِس سوالیہ فقرے میں سخت ملامت کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبی، کیا یہ لوگ اِس قدر جری اور بے باک ہیں کہ تم جیسے شخص پر افترا، اور وہ بھی افتراء علی اللہ جیسے گھناؤنے فعل کا الزام رکھتے ہوئے اِنہیں ذرا شرم نہیں آتی؟ یہ تم پر تہمت لگاتے ہیں کہ تم اس قرآن کو خود تصنیف کر کے جھوٹ موٹ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہو؟

۴۴؎ یعنی اتنے بڑے جھوٹ صرف وہی لوگ بولا کرتے ہیں جن کے دلوں پر مُہر لگی ہوئی ہے۔ اگر اللہ چاہے تو تمہیں بھی اُن میں شامل کر دے۔ مگر اُس کا یہ فضل ہے کہ اُس نے تمہیں اِس گروہ سے الگ رکھا ہے۔ اِس جواب میں اُن لوگوں پر شدید طنز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام رکھ رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبی، ان لوگوں نے تمہیں بھی اپنی قماش کا آدمی سمجھ لیا ہے۔ جس طرح یہ خود اپنی اغراض کے لیے ہر بڑے سے بڑا جھوٹ بول جاتے ہیں، انہوں نے خیال کیا کہ تم بھی اُسی طرح اپنی دوکان چمکانے کے لیے ایک جھوٹ گھڑ لائے ہو۔ لیکن یہ اللہ کی عنایت ہے کہ اس نے تمہارے دل پر وہ مہر نہیں لگائی ہے جو اِن کے دلوں پر لگا رکھی ہے۔

۴۵؎ یعنی یہ اللہ کی عادت ہے کہ وہ باطل کو کبھی پائیداری نہیں بخشتا اور آخر کار حق کو حق ہی کر کے

اور برائیوں سے درگزر کرتا ہے، حالانکہ تم لوگوں کے سب افعال کا اسے علم ہے[۴۵] - وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دُعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دیتا ہے - رہے انکار کرنے والے، تو ان کے لیے دردناک سزا ہے -

اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور اُن پر نگاہ رکھتا ہے[۴۶]- وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد مینہ

دکھا دیتا ہے - اس لیے اے نبی، تم ان جھوٹے الزامات کی ذرہ برابر پروانہ کرو، اور اپنا کام کیے جاؤ- ایک وقت آئے گا کہ یہ سارا جھوٹ غبار کی طرح اڑ جائے گا اور جس چیز کو تم پیش کر رہے ہو اس کا حق ہونا عیاں ہو جائے گا -

۴۶؎ یعنی اُس کو معلوم ہے کہ یہ الزامات تم پر کیوں لگائے جا رہے ہیں اور یہ ساری تگ و دو جو تمہیں زک دینے کے لیے کی جا رہی ہے، اِس کے پیچھے درحقیقت کیا اغراض اور کیا نیتیں کام کر رہی ہیں-

۴۷؎ پچھلی آیت کے معًا بعد توبہ کی ترغیب دینے سے خود بخود یہ مضمون نکلتا ہے کہ ظالمو، سچے نبی پر یہ جھوٹے الزامات رکھ کر کیوں اپنے آپ کو اور زیادہ خدا کے عذاب کا مستحق بناتے ہو، اب بھی اپنی اِن حرکتوں سے باز آ جاؤ اور توبہ کر لو تو اللہ معاف فرما دیگا-توبہ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے کیے پر نادم ہو، جس بُرائی کا وہ مرتکب ہُوا ہے یا ہوتا رہا ہے اس سے فوراً باز آ جائے، اور آئندہ اس کا ارتکاب نہ کرے - نیز یہ بھی سچی توبہ کا لازمی تقاضا ہے کہ جو بُرائی کسی شخص نے پہلے کی ہے اُس کی تلافی کرنے کی وہ اپنی حد تک پُوری کوشش کرے، اور جہاں تلافی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، وہاں اللہ سے معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے اُس دھبّے کو دھوتا رہے جو اس نے اپنے دامن پر لگا لیا ہے لیکن کوئی توبہ اُس وقت تک حقیقی توبہ نہیں ہے جب تک کہ وہ اللہ کو راضی کرنے کی نیّت سے نہ ہو کسی دوسری وجہ یا غرض سے کسی بُرے فعل کو چھوڑ دینا سرے سے توبہ کی تعریف ہی میں نہیں آتا -

۴۸؎ جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اُسے نظر میں رکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا

برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے، اور وہی قابلِ تعریف ولی ہے[۴۹]۔ اُس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش، اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں[۵۰]۔ وہ جب چاہے انہیں اکٹھا کر سکتا ہے[۵۱]۔ تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے، اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے[۵۲]۔ تم زمین میں

ہے کہ یہاں دراصل اللہ تعالیٰ اُس بنیادی سبب کی طرف اشارہ فرما رہا ہے جو کفارِ مکہ کی سرکشی میں کام کر رہا تھا۔ اگرچہ روم و ایران کے مقابلہ میں ان کی کوئی ہستی نہ تھی اور گردوپیش کی قوموں میں وہ ایک پس ماندہ قوم کے ایک تجارت پیشہ قبیلے، یا بالفاظِ دیگر، بنجاروں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے، مگر اپنی اس ذرا سی دنیا میں ان کو دوسرے عربوں کی بہ نسبت جو خوشحالی اور بڑائی نصیب تھی اُس نے اُن کو اتنا مغرور و متکبر بنا دیا تھا کہ وہ اللہ کے نبی کی بات پر کان دھرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے، اور ان کے سردارانِ قبائل اِس کو اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے کہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پیشوا ہوں اور وہ اُن کی پیروی کریں۔ اِسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ اگر کہیں ہم اِن چھوٹے ظرف کے لوگوں پر واقعی رزق کے دروازے کھول دیتے تو یہ بالکل ہی پھٹ پڑتے، مگر ہم نے اِنہیں دیکھ کر ہی رکھا ہے، اور ناپ تول کر ہم انہیں بس اتنا ہی دے رہے ہیں جو اِن کو آپے سے باہر نہ ہونے دے۔ اِس معنی کے لحاظ سے یہ آیت دوسرے الفاظ میں وہی مضمون ادا کر رہی ہے جو سورۂ توبہ، آیات ۶۸ - ۷۰، الکہف، آیات ۳۲ - ۴۲، القصص، آیات ۷۵ - ۸۲، الروم، آیت ۹، سبا، آیت ۳۴ - ۳۶ - اور المومن آیات ۸۲ - ۸۵ میں بیان ہوا ہے۔

۴۹ یہاں ولی سے مراد وہ ہستی ہے جو اپنی پیدا کردہ ساری مخلوق کے معاملات کی متولی ہے جس نے بندوں کی حاجات و ضروریات پوری کرنے کا ذمّہ لے رکھا ہے۔

۵۰ یعنی زمین میں بھی اور آسمانوں میں بھی۔ یہ کھلا اشارہ ہے اِس طرف کہ زندگی صرف زمین پر ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ دوسرے سیاروں میں بھی جاندار مخلوقات موجود ہیں۔

۵۱ یعنی جس طرح وہ انہیں پھیلا دینے پر قادر ہے اُسی طرح وہ انہیں جمع کر لینے پر بھی قادر ہے۔

اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو، اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے۔
اُس کی نشانیوں میں سے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اللہ جب چاہے
ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں ـــــ اِس میں بڑی
نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو کمال درجہ صبر و شکر کرنے والا ہو۵۵ ـــــ یا (اُن پر سوار ہونے

لہٰذا یہ خیال کرنا غلط ہے کہ قیامت نہیں آسکتی اور تمام اوّلین و آخرین کو یک وقت اٹھا کر اکٹھا نہیں کیا جاسکتا۔
۵۴ واضح رہے کہ یہاں تمام انسانی مصائب کی وجہ بیان نہیں کی جارہی ہے، بلکہ روئے سخن اُن لوگوں
کی طرف ہے جو اس وقت مکہ معظمہ میں کفر و نافرمانی کا ارتکاب کر رہے تھے۔ اُن سے فرمایا جارہا ہے کہ اگر اللہ
تمہارے سارے قصوروں پر گرفت کرتا تو تمہیں جیتا ہی نہ چھوڑتا، لیکن یہ مصائب جو تم پر نازل ہوئے ہیں
(غالباً اشارہ ہے مکّہ کے قحط کی طرف)، یہ محض بطورِ تنبیہ ہیں تاکہ تم ہوش میں آؤ، اور اپنے اعمال کا جائزہ
لے کر دیکھو کہ اپنے رب کے مقابلے میں تم نے کیا روش اختیار کر رکھی ہے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ جس
خدا سے تم بغاوت کر رہے ہو اس کے مقابلے میں تم کتنے بے بس ہو، اور یہ جانو کہ جنہیں تم اپنا ولی و کارساز
بنائے بیٹھے ہو، یا جن طاقتوں پر تم نے بھروسہ کر رکھا ہے وہ اللہ کی پکڑ سے بچانے میں تمہارے کسی کام
نہیں آسکتیں۔
مزید توضیح کے لیے یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ جہاں تک مومنِ مخلص کا تعلق ہے اُس کے لیے
اللہ کا قانون اِس سے مختلف ہے۔ اس پر جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی آتی ہیں وہ سب اس کے گناہوں اور
خطاؤں اور کوتاہیوں کا کفارہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے کہ مَا یُصِیبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَ
لَا وَصَبٍ وَلَا هَمٍّ وَلَا حُزْنٍ وَلَا اَذًى وَلَا غَمٍّ حَتّٰى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ
(بخاری و مسلم) "مسلمان کو جو رنج اور دکھ اور فکر اور غم اور تکلیف اور پریشانی بھی پیش آتی ہے، حتیٰ کہ ایک کانٹا
بھی اگر اس کو چبھتا ہے تو اللہ اس کو اس کی کسی نہ کسی خطا کا کفارہ بنا دیتا ہے۔" رہے وہ مصائب جو اللہ کی
راہ میں اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کوئی مومن برداشت کرتا ہے، تو وہ محض کوتاہیوں کا کفارہ ہی نہیں ہوتے
بلکہ اللہ کے ہاں ترقی درجات کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تصور کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ

والوں کے اہیت سے گناہوں سے درگزر کرتے ہوئے ان کے چند ہی کرتوتوں کی پاداش میں انہیں ڈبو دے، اور اُس وقت ہماری آیات میں جھگڑے کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۵۵۔

جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے۵۶، اور جو کچھ اللہ

وہ گناہوں کی سزا کے طور پر نازل ہوتے ہیں۔

۵۳؎ "صبر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اچھے اور بُرے تمام حالات میں بندگی کے رویے پر ثابت قدم رہے جس کا حال یہ نہ ہو کہ اچھا وقت آئے تو اپنی ہستی کو بھول کر خدا سے باغی اور بندوں کے حق میں ظالم بن جائے، اور بُرا وقت آجائے تو دل چھوڑ بیٹھے اور ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے پر اُتر آئے۔ "شکر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جسے تقدیرِ الٰہی خواہ کتنا ہی اونچا اٹھا لے جائے، وہ اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ کا احسان ہی سمجھتا رہے، اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے، اس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے اُن نعمتوں پر ہی مرکوز رہے جو بُرے سے بُرے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں، اور خوشحالی و بدحالی، دونوں حالتوں میں اس کی زبان اور اس کے دل سے اپنے رب کا شکر ہی ادا ہوتا رہے۔

۵۴؎ قریش کے لوگوں کو اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں حبش اور افریقہ کے ساحلی علاقوں کی طرف بھی جانا ہوتا تھا، اور ان سفروں میں وہ بادبانی جہازوں اور کشتیوں پر بحرِ احمر سے گزرتے تھے جو ایک بڑا خطرناک سمندر ہے۔ اس میں اکثر طوفان اٹھتے رہتے ہیں اور زیرِ آب چٹانیں کثرت سے ہیں جن سے طوفان کی حالت میں ٹکرا جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے جس کیفیت کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے یہاں کھینچا ہے اسے قریش کے لوگ اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں پوری طرح محسوس کر سکتے تھے۔

۵۵؎ یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر آدمی پھول جائے۔ بڑی سے بڑی دولت بھی جو دنیا میں کسی شخص کو ملی ہے، ایک تھوڑی سی مدت ہی کے لیے ملی ہے۔ چند سال وہ اُس کو برت لیتا ہے اور پھر سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دولت بھی چاہے بہی کھاتوں میں کتنی ہی بڑی ہو، عملاً اس کا ایک قلیل سا حصہ ہی آدمی کے اپنے استعمال میں آتا ہے۔ اس مال پر اِترانا کسی

کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔[۵۶] وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں[۵۷]، جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں[۵۸] اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں[۵۹]، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں[۶۰]، نماز قائم

ایسے انسان کا کام نہیں ہے جو اپنی اور اِس مال و دولت کی، اور خود اِس دنیا کی حقیقت کو سمجھتا ہو۔

۵۶ یعنی وہ دولت اپنی نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے، اور پھر وقتی و عارضی بھی نہیں ہے بلکہ ابدی اور لازوال ہے۔

۵۷ اللہ پر توکل کو یہاں ایمان لانے کا لازمی تقاضا، اور آخرت کی کامیابی کے لیے ایک ضروری وصف قرار دیا گیا ہے۔ توکل کے معنی یہ ہیں کہ: اولاً، آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی پر کامل اعتماد ہو اور وہ یہ سمجھے کہ حقیقت کا جو علم، اخلاق کے جو اصول، حلال و حرام کے جو حدود، اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو قواعد و ضوابط اللہ نے دیئے ہیں وہی برحق ہیں اور انہی کی پیروی میں انسان کی خیر ہے۔ ثانیاً، آدمی کا بھروسا اپنی طاقت و قابلیت، اپنے ذرائع و وسائل، اپنی تدابیر، اور اللہ کے سوا دوسروں کی امداد و اعانت پر نہ ہو، بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے کہ دنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں اُس کی کامیابی کا اصل انحصار اللہ کی توفیق و تائید پر ہے، اور اللہ کی توفیق و تائید کا وہ اسی صورت میں مستحق ہو سکتا ہے جبکہ وہ اُس کی رضا کو مقصود بنا کر، اُس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کرتے ہوئے کام کرے۔ ثالثاً، آدمی کو اُن وعدوں پر پورا بھروسا ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عملِ صالح کا رویہ اختیار کرنے والے اور باطل کے بجائے حق کے لیے کام کرنے والے بندوں سے کیے ہیں، اور انہی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اُن تمام فوائد اور منافع اور لذائذ کو لات مار دے جو باطل کی راہ پر جانے کی صورت میں اسے حاصل ہوتے نظر آتے ہوں، اور اُن سارے نقصانات اور تکلیفوں اور محرومیوں کو انگیز کر جائے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اُس کے نصیب میں آئیں۔ توکل کے معنی کی اِس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کا کتنا گہرا تعلق ہے، اور اُس کے بغیر جو ایمان محض خالی خولی اعتراف و اقرار کی حد تک ہو اُس سے وہ شاندار نتائج کیوں نہیں حاصل ہو

کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں[۶۱]، ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے

سکتے جن کا وعدہ ایمان لا کر توکل کرنے والوں سے کیا گیا ہے۔

۵۸ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، صفحات ۳۴۶-۳۴۷-۵۹۸-۵۹۹۔ جلد دوم، ص ۵۶۶۔ نیز سورۂ نجم، آیت ۳۲۔

۵۹ یعنی وہ غصیل اور جھلے نہیں ہوتے، بلکہ نرم خو اور دھیمے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی سرشت انتقامی نہیں ہوتی بلکہ وہ بندگانِ خدا سے درگزر اور چشم پوشی کا معاملہ کرتے ہیں، اور کسی بات پر غصہ آ بھی جاتا ہے تو اسے پی جاتے ہیں۔ یہ وصف انسان کی بہترین صفات میں سے ہے جسے قرآن مجید میں نہایت قابلِ تعریف قرار دیا گیا ہے (آلِ عمران، آیت ۱۳۴) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے بڑے اسباب میں شمار کیا گیا ہے (آل عمران، ۱۵۹)۔ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ ما انتقم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لنفسہ فی شیئ قط الا ان تنتھک حرمۃ اللہ (بخاری و مسلم)، "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا۔ البتہ جب اللہ کی حرمتوں میں سے کسی حرمت کی ہتک کی جاتی تب آپ سزا دیتے تھے۔"

۶۰ لفظی ترجمہ ہو گا "اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں"، یعنی جس کام کے لیے بھی اللہ بلاتا ہے اس کے لیے دوڑ پڑتے ہیں، اور جس چیز کی بھی اللہ دعوت دیتا ہے اسے قبول کرتے ہیں۔

۶۱ اس چیز کو یہاں اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے، اور سورۂ آل عمران (آیت ۱۵۹) میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس بنا پر مشاورت اسلامی طرزِ زندگی کا ایک اہم ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ اِس کے وجوہ پر اگر غور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو، اُس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات

میں کسی کو اپنی من مانی چلانے کا حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو اُس میں ان سب کی رائے لی جائے، اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو اُن کے معتمد علیہ نمائندوں کو شریکِ مشورہ کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مانی چلانے کی کوشش یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے، یا پھر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح ہیں، اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے، اور نہ وہ متکبّر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقلِ کل اور علیم و خبیر سمجھے۔

تیسرے یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو اُن میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمّہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دہی اُسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی، کبھی اس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اِس طرح کی جرأتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی بازپرس کا احساس رکھنے والا آدمی تو لازماً یہ کوشش کریگا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو اُن سب کو، یا اُن کے اپنے بھروسے کے نمائندوں کو اس کا فیصلہ کرنے میں شریکِ مشورہ کرے، تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لاگ اور مبنی بر انصاف فیصلہ کیا جا سکے، اور اگر نادانستہ کوئی غلطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک ہی شخص پر اس کی ذمّہ داری نہ آ پڑے۔

یہ تین وجوہ ایسے ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آسکتی ہے کہ اسلام جس اخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے، مشورہ اُس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بداخلاقی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرز زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے

سے کام کریں اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انہیں بھی شریکِ مشورہ کیا جائے۔ خاندان کے معاملات ہوں تو اُن میں کنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے۔ ایک قبیلے یا برادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریکِ مشورہ ہونا ممکن نہ ہو، تو ان کا فیصلہ کوئی ایسی پنچایت یا مجلس کرے جس میں کسی متفق علیہ طریقے کے مطابق تمام متعلق لوگوں کے معتمد علیہ نمائندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو اُن کو چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے، اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحبِ رائے لوگوں کے مشورے سے چلائے جن کو قوم قابلِ اعتماد سمجھتی ہو، اور وہ اُسی وقت تک سربراہ رہے جب تک قوم خود اسے اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہے۔ کوئی ایماندار آدمی زبردستی قوم کا سربراہ بننے اور بنے رہنے کی خواہش یا کوشش نہیں کر سکتا، نہ یہ فریب کاری کر سکتا ہے کہ پہلے بزور قوم کے سر پر مسلّط ہو جائے اور پھر جبر کے تحت لوگوں کی رضامندی طلب کرے، اور نہ اِس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے لیے لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسند کے نمائندے نہیں بلکہ وہ نمائندے منتخب کریں جو اُس کی مرضی کے مطابق رائے دینے والے ہوں۔ ایسی ہر خواہش صرف اُس نفس میں پیدا ہوتی ہے جو نیّت کی خرابی سے ملوّث ہو، اور اِس خواہش کے ساتھ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی ظاہری شکل بنانے اور اس کی حقیقت غائب کر دینے کی کوششیں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جسے خدا اور خلق دونوں کو دھوکا دینے میں کوئی باک نہ ہو، حالانکہ نہ خدا دھوکا کھا سکتا ہے، اور نہ خلق ہی اتنی اندھی ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں علانیہ ڈاکہ مار رہا ہو اور وہ سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکہ نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔

اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کا قاعدہ خود اپنی نوعیّت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

اوّل یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں انہیں اظہارِ رائے کی پوری آزادی حاصل ہو، اور وہ اِس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ اُن کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں، اور انہیں اس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات

کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں، اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر اُن کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بے ایمانی ہے جسے کوئی شخص بھی اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو اسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے، اور یہ رضامندی ان کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی، یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی، یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقہ سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو، اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیئے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر، یا مال سے خرید کر، یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر، یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں، اور اس طرح کے اظہارِ رائے کی انہیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر، یا کسی جتھہ بندی میں کسے ہوتے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں درحقیقت خیانت اور غداری ہوگی نہ کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہلِ شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے، یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے

اُس میں سے خرچ کرتے ہیں[۶۲]، اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں[۶۳]۔

سے چلتے ہیں"۔ اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔

اسلام کے اصولِ شوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مطلق العنان اور مختارِ کُل نہیں ہے بلکہ لازماً اُس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے، اور اس اصل الاصول کی پابند ہے کہ "تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے"، اور "تمہارے درمیان جو نزاع بھی ہو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو"۔ اِس قاعدۂ کلیہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اِس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے، اور اُس پر عملدرآمد کس طریقہ سے کیا جائے تاکہ اُس کا منشا ٹھیک طور سے پُورا ہو، لیکن اِس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے کر دیا ہو اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلہ کریں۔

۶۲ اس کے تین مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جو رزقِ حلال ہم نے انہیں دیا ہے اُسی میں سے خرچ کرتے ہیں، اپنے اخراجات پُورے کرنے کے لیے مالِ حرام پر ہاتھ نہیں مارتے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دیے ہوئے رزق کو سَینت کر نہیں رکھتے بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ جو رزق انہیں دیا گیا ہے اُس میں سے راہِ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں، سب کچھ اپنی ہی ذات کے لیے وقف نہیں کر دیتے۔ پہلے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف رزقِ حلال و طیّب ہی کو "اپنے دیے ہوئے رزق" سے تعبیر فرماتا ہے، ناپاک اور حرام طریقوں سے کماتے ہوئے رزق کو وہ اپنا رزق نہیں کہتا۔ دوسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رزق انسان کو دیتا ہے وہ خرچ کرنے کے لیے دیتا ہے، سَینت سَینت کر رکھنے اور اس پر مارِ زرین کر بیٹھ جانے کے لیے نہیں دیتا۔ اور تیسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ خرچ کرنے سے مراد قرآن مجید میں محض اپنی ذات پر اور اپنی ضروریات پر ہی خرچ کر دینا نہیں ہے، بلکہ اس کے مفہوم میں اِنفاق فی سبیل اللہ بھی شامل ہے۔ انہی تین وجوہ سے اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کو یہاں اہلِ ایمان کی اُن بہترین صفات میں شمار فرما رہا ہے جن کی بنا پر آخرت کی بھلائیاں انہی کے لیے مختص کی گئی ہیں۔

۶۳ یہ بھی اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں سے ہے۔ وہ ظالموں اور

۶۴ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۶۵، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۶۶، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۶۷۔ اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت

جباروں کے لیے نرم چارہ نہیں ہوتے۔ اُن کی نرم خوئی اور عفو و درگزر کی عادت کمزوری کی بنا پر نہیں ہوتی۔ انہیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کر دیں، جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں، اور جب کسی زیردست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں، لیکن جب کوئی طاقتور اپنی طاقت کے زعم میں اُن پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں اور اس کے دانت کھٹے کر دیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور متکبر کے آگے نہیں جھکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لیتا ہے۔

۶۴ یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت آیتِ ماسبق کی تشریح کے طور پر ہے۔

۶۵ یہ پہلا اصولی قاعدہ ہے جسے بدلہ لینے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بدلے کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی برائی کسی کے ساتھ کی گئی ہو، اتنی ہی برائی وہ اس کے ساتھ کر لے، اُس سے زیادہ برائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔

۶۶ یہ دوسرا قاعدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لینا اگرچہ جائز ہے لیکن جہاں معاف کر دینا اصلاح کا موجب ہو سکتا ہو وہاں اصلاح کی خاطر بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور چونکہ یہ معافی انسان اپنے نفس پر جبر کر کے دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا اجر ہمارے ذمہ ہے، کیونکہ تم نے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے۔

۶۷ اس تنبیہ میں بدلہ لینے کے متعلق ایک تیسرے قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے ظلم کا انتقام لیتے لیتے خود ظالم نہیں بن جانا چاہیے۔ ایک برائی کے بدلے میں اُس سے بڑھ کر برائی کر گزرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایک تھپڑ مارے تو وہ اسے ایک

نہیں کی جا سکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔[۶۵] ع

ع

ہی تھپڑ مار سکتا ہے۔ لات گھونسوں کی اُس پر بارش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں لینا درست نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بیٹے کو اگر کسی ظالم نے قتل کیا ہے تو اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جا کر اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔ یا کسی شخص کی بہن یا بیٹی کو اگر کسی کمینہ انسان نے خراب کیا ہے تو اس کے لیے یہ حلال نہیں ہو جائے گا کہ وہ اس کی بیٹی یا بہن سے زنا کرے۔

۶۵ واضح رہے کہ اِن آیات میں اہلِ ایمان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ اُس وقت عملاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی زندگیوں میں موجود تھیں، اور کفارِ مکہ اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔ اِس طرح اللہ تعالیٰ نے دراصل کفار کو یہ بتایا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی بسر کرنے کا جو سروسامان پا کر تم آپے سے باہر ہوتے جاتے ہو، اصل دولت وہ نہیں ہے، بلکہ اصل دولت یہ اخلاق اور اوصاف ہیں جو قرآن کی رہنمائی قبول کر کے تمہارے ہی معاشرے کے اِن مومنوں نے اپنے اندر پیدا کیے ہیں۔

قرآن کی معاشی تعلیمات

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

(۳)

۱۵- لازمی زکوٰۃ اور اُس کی شرح قرآن نے اس تعلیم و ہدایت سے معاشرے کے افراد میں رضاکارانہ انفاق فی سبیل اللہ کی ایک عام رُوح پھونک دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ ہدایت کی کہ آپ کم سے کم اِنفاق کی ایک حد مقرر کر کے ایک فریضہ کے طور پر اسلامی ریاست کی طرف سے اس کی تحصیل اور تقسیم کا انتظام کریں:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (۹: ۱۰۳) (اے نبی) ان کے اموال میں سے ایک صدقہ وصول کرو۔

یہ "ایک صدقہ" کا لفظ اِس امر کی طرف اشارہ تھا کہ عام صدقات، جو فرداً فرداً بطور خود لوگ دیتے ہیں، اُن کے علاوہ ایک خاص مقدارِ صدقہ اُن پر فرض کر دی جائے، اور اُس کا تعیّن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم خود کریں۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے مختلف اقسام کی ملکیتوں کے بارے میں ایک کم سے کم حد مقرر فرما دی جس سے کم پر فرض زکوٰۃ عائد نہ ہوگی پھر بقدر نصاب یا اس سے زائد ملکیتوں پر مختلف اموال کے معاملہ میں زکوٰۃ کی حسبِ ذیل شرح مقرر فرمائی[18]۔

(۱) سونے چاندی اور زرِ نقد کی صورت میں جو دولت جمع ہو[19] اس پر ۲½ فیصد سالانہ۔

---

[18] الشوکانی، نیل الاوطار، ج ۴، ص ۹۸-۱۲۴، مصطفی البابی، مصر، ۱۳۴۷ھ

[19] بعد میں اجماع سے یہ طے کیا گیا کہ تجارتی اموال پر بھی ۲½ فیصد سالانہ کے حساب سے زکوٰۃ عائد کی جائے الشوکانی

(۲) زرعی پیداوار پر جبکہ وہ بارانی زمینوں سے ہو ۱۰ فیصد

(۳) " " " جبکہ وہ مصنوعی آب پاشی سے ہو ۵ فیصد

(۴) معدنیات پر جبکہ وہ نجی ملکیت میں ہوں اور دفینوں پر ۲۰ فیصد

(۵) مواشی پر، جو افزائش نسل اور فروخت کی غرض سے پالے جائیں زکوٰۃ کی شرح بھیڑ بکری گائے اونٹ وغیرہ جانوروں کے معاملے میں مختلف ہے جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ مقدارِ زکوٰۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ کے حکم سے اُسی طرح مسلمانوں پر فرض کی ہے جس طرح روزانہ پانچ وقت کی چند رکعت نمازیں آپ نے اُس کے حکم سے فرض کی ہیں۔ دینی فریضے اور لزوم کے اعتبار سے ان دونوں کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن مجید اس بات کو اسلامی حکومت کے بنیادی مقاصد میں شمار کرتا ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ (۲۲ : ۴۱)

(یہ اہلِ ایمان جن کو دفاعی جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے، وہ لوگ ہیں) جنہیں اگر ہم نے زمین میں اقتدار بخشا تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے، اور بدی سے روکیں گے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ ... وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (۲۴ : ۵۵-۵۶)

اللہ نے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے یہ وعدہ کیا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا ... اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

لیکن، جیسا کہ اوپر کی آیات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے، فرض زکوٰۃ کی تحصیل اور تقسیم کا

۴- ج ۴، ص ۱۱۷- تجارتی زکوٰۃ کا یہ اصول اُن کارخانوں پر بھی عائد ہو گا جو فروخت کے لیے مختلف قسم کے سامان تیار کرتے ہیں۔

انتظام اگرچہ اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے، مگر اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں، یا مسلم حکومت کے اس طرف سے غفلت برتنے کی صورت میں، مسلمانوں پر سے یہ فرض ساقط نہیں ہو جاتا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح نماز کا فرض ساقط نہیں ہوتا۔ کوئی اگر وصول کرنے اور تقسیم کرنے والا نہ ہو تو ہر صاحبِ نصاب مسلمان کو خود اپنے مال سے زکوٰۃ نکالنی اور تقسیم کرنی چاہیے۔

۱۶۔ اموالِ غنیمت کا خُمس | فرض زکوٰۃ عائد کرنے سے جو فنڈ فراہم ہوتا ہے اس پر قرآن نے ایک اور مد کا اضافہ بھی کیا ہے اور وہ ہے اموالِ غنیمت (SPOILS OF WAR) کا ایک حصّہ۔ قرآن نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ ہر لڑائی میں جو غنیمت کا مال فوج کے ہاتھ آئے اسے سپاہی بطورِ خود نہ لوٹ لیں بلکہ سب کچھ لا کر اپنے کمانڈر کے حوالہ کر دیں، اور کمانڈر اس کے پانچ حصے کر کے چار حصے ان سپاہیوں میں تقسیم کرے جنہوں نے معرکے میں حصّہ لیا ہو، اور پانچواں حصّہ الگ کر کے حکومت کے حوالہ کر دے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (۸ : ۴۱)	تم کو معلوم ہو کہ جو کچھ بھی غنیمت تم حاصل کرو اس کا پانچواں حصّہ اللہ اور رسول اور قرابت داروں[۱۱] اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافر کے لیے ہے۔

---

[۱۱] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیات میں غنیمت کے خمس میں سے ایک حصّہ خود حضورؐ اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات کے لیے لیتے تھے، کیونکہ زکوٰۃ میں آپ کا اور آپ کے رشتہ داروں کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد اس امر میں اختلاف ہوا کہ رسول اور قرابت داروں کا حصّہ کس کو دیا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ یہ حصّہ آنحضرتؐ کے لیے سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے تھا اور اب یہ آپ کے خلیفہ اور اس کے متعلقین کا حق ہے۔ بعض دوسرے لوگوں کی رائے تھی کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد بھی آپ ہی کے متعلقین کا حق ہے۔ آخر کار اس بات پر اتفاق ہوا کہ وہ حصّہ جو آنحضرتؐ اور ان کے متعلقین کے لیے تھا، اب اسلامی حکومت کی جنگی ضروریات کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ (الجصاص، ج ۳، ص ۷۵-۷۷)۔

۱۷۔ **مصارفِ زکوٰۃ** | اِن دونوں مدات سے جو مال حاصل ہو وہ قرآن کی رُو سے خزانۂ عامّہ (PUBLIC EXCHEQUER) کا کوئی حصہ نہیں ہے جس کا مقصد زکوٰۃ دینے والوں سمیت تمام لوگوں کے لیے آسائشیں اور ضروری خدمات بہم پہنچانا ہوتا ہے، بلکہ قرآن نے اسے حسبِ ذیل مصارف کے لیے مخصوص کیا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ (۹ : ۶۰)

صدقات تو مخصوص ہیں فقراء[۲۱] کے لیے اور مساکین[۲۲] کے لیے اور اُن لوگوں کے لیے جو صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام کریں، اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو[۲۳]، نیز وہ صرف ہونے چاہییں غلاموں کی گردنیں چھڑانے میں[۲۴]، قرض داروں کی مدد میں، اللہ

---

۲۱ فقر کے اصل معنی حاجت کے ہیں اور فقیر ہر وہ شخص ہے جو اپنی ضرورت سے کم معاش پانے کے باعث مدد کا محتاج ہو۔ (لسان العرب، ج ۵، ص ۶۰-۶۱، بیروت ۱۹۵۶ء)

۲۲ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ مسکین وہ شخص ہے جو کما نہ سکتا ہو یا کمانے کا موقع نہ پاتا ہو۔ (الجصاص، ج ۳، ص ۱۵۱) اس تعریف کی رُو سے تمام وہ غریب بچے جو ابھی کمانے کے قابل نہ ہوئے ہوں، اور اپاہج اور بوڑھے جو کمانے کے قابل نہ رہے ہوں، اور بے روزگار یا بیمار جو عارضی طور پر کمانے کے موقع سے محروم ہو گئے ہوں، مسکین ہیں۔

۲۳ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تین قسم کے لوگوں کو تالیفِ قلب کے لیے روپیہ دیا جاتا تھا (۱) جو مخالفینِ اسلام کمزور مسلمانوں کو تکلیفیں دیتے یا اسلام کی عداوت میں سخت تھے انہیں روپیہ دے کر نرم رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ (۲) جو لوگ اپنی قوم یا قبیلے کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے زبردستی روکتے تھے انہیں روپیہ دے کر اس روش سے باز آجانے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ (۳) جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوتے تھے ان کی مالی مدد کی جاتی تھی تاکہ اُن کا اضطراب رفع ہو اور وہ مطمئن ہو کر مسلمانوں کے گروہ میں رہیں۔ (الجصاص، ج ۳، ص ۱۵۲)

۲۴ اس سے مراد وہ مسلمان بھی ہیں جو لڑائیوں میں دشمنوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر غلام بنا لیے جاتے تھے؛

کی راہ میں[25] اور مسافروں کی خبر گیری میں[26]، اللہ کی طرف سے ایک فریضہ کے طور پر۔

۱۸۔ تقسیمِ میراث کا قانون کسی مرد یا عورت کی وفات پر اس کے متروکہ مال کے متعلق قرآن کا قانون یہ ہے کہ یہ مال اس کے والدین، اس کی اولاد، اور اس کی بیوی یا شوہر کے درمیان ایک مقرر نسبت کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔ اور اگر والدین اور اولاد نہ ہوں تو اس کے حقیقی اور علاتی اور اخیافی (یعنی ماں شریک اور باپ شریک) بھائی بہنوں کو حصہ دیا جائے۔ اس کے متعلق مفصل احکام سورۂ نساء میں بیان ہوئے ہیں[27] (ملاحظہ ہو آیت ۷ تا ۱۲، اور آیت ۱۷۶) یہاں ہم بخوفِ طوالت انہیں نقل نہیں کرتے۔

اس معاملہ میں قرآن نے جو اصول اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جو مال ایک شخص کی زندگی میں یکجا مرتکز ہو گیا ہو وہ اس کے مرنے کے بعد مرتکز نہ رہنے دیا جائے بلکہ اس کے قرابت داروں میں پھیلا دیا جائے۔ یہ اصول توریثِ خلفِ اکبر (PRIMOGENITURE) اور مشترک خاندانی جائداد (JOINT FAMILY SYSTEM) اور ایسے ہی دوسرے طریقوں کے برعکس ہے، جن کا

اور وہ غیر مسلم بھی جو مسلمانوں کے ہاں جنگ میں گرفتار ہو کر آتے اور فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ نیز وہ غلام بھی مراد ہیں جو پہلے سے غلام چلے آرہے تھے۔

[25] اللہ کی راہ سے مراد جہاد اور حج ہے۔ جہاد میں جانے والا رضاکار اگر اپنی ضروریات کی حد تک مالدار بھی ہو، تب بھی وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ کیونکہ جہاد کے لیے تیاری کرنے اور سفر وغیرہ کے مصارف بہم پہنچانے کے لیے آدمی کا ذاتی مال کافی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حج کے سفر میں اگر آدمی کا زادِ راہ ختم ہو جائے تو وہ بھی زکوٰۃ کا مستحق ہے۔ (الجصاص، ج ۳، ص ۵۷-۱۵۶۔ نیل الاوطار ج ۴، ص ۴۶-۱۴۴)

[26] مسافر اپنے گھر پر چاہے مالدار بھی ہو، لیکن حالتِ سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اسے زکوٰۃ لینے کا حق پہنچتا ہے۔ (الجصاص، ج ۳، ص ۱۵۷)۔

[27] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کی جو تشریح فرمائی ہے اس کی رُو سے قریب ترین رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں میراث قریب تر رشتہ داروں کو پہنچے گی اور ان کی غیر موجودگی میں بدرجۂ آخر اسے ان لوگوں

بنیادی مقصد یہ ہے کہ مرتکز شدہ دولت مرنے والے کے بعد بھی مرتکز ہی رہے۔

اسی طرح قرآن متبنّٰی بنانے کے طریقے کو بھی رد کر دیتا ہے اور یہ قاعدہ مقرر کرتا ہے کہ جو لوگ واقعی رشتہ دار ہیں، میراث میں حق انہی کا ہے، کسی غیر آدمی کو بیٹا بنا کر مصنوعی طور پر وارث نہیں بنایا جا سکتا۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ (۳۳ : ۴)	اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنایا ہے، یہ تو ایک بات ہے جو تم بس اپنے منہ سے نکالتے ہو۔
وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ (۳۳ : ۶)	اور رشتہ دار ہی اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

لیکن حقیقی وارث رشتہ داروں کے حقوق کی پوری طرح حفاظت کر دینے کے بعد قرآن ان کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ تقسیم میراث کے موقع پر جو غیر وارث رشتہ دار آئیں ان کو بھی وہ اپنی خوشی سے کچھ نہ کچھ دیں:

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ (۴ : ۸-۹)	اور جب تقسیم کے موقع پر رشتہ دار اور یتیم اور مسکین لوگ آئیں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دو اور ان سے اچھی طرح بات کرو۔ لوگوں کو ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ رہے ہوتے تو انہیں کیسے کیسے اندیشے لاحق ہوتے، پس چاہیے کہ لوگ اللہ سے ڈریں۔

۱۹- وصیت کا قاعدہ قرآن مجید وراثت کا قانون مقرر کرنے کے ساتھ آدمی کو یہ ہدایت بھی دیتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے ترکے کے بارے میں وصیت کر دے:

میں تقسیم کیا جائے گا جو غیروں کی بہ نسبت میت سے کوئی قرابت رکھتے ہوں لیکن اگر کوئی رشتہ دار سرے سے موجود ہی نہ ہو تو پھر یہ مال اسلامی حکومت کے خزانہ میں داخل ہوگا۔ (نیل الاوطار، ج ۶، ص ۴۷-۵۶)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۲ : ۱۸۰)	تم پر لکھ دیا گیا کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ کافی مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے جائز طریقہ پر وصیت کر دے، یہ حق ہے پرہیزگاروں پر۔

اس حکم کا منشا یہ ہے کہ ایک تو مرنے والا خصوصیت کے ساتھ اپنے والدین کے حق میں اپنی اولاد کو حُسنِ سلوک کی وصیت کر جائے، کیونکہ ان سے بوڑھے دادا دادی کی خدمت کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے۔ دوسرے اس کے خاندان میں جو افراد ایسے ہوں جنہیں قانون کے مطابق میراث میں سے حصّہ نہیں پہنچتا، مگر مرنے والا انہیں مدد کا مستحق سمجھتا ہو تو انہیں اپنے ترکے میں سے حصّہ دینے کی وصیّت کر دے۔ اس کے علاوہ ایک شخص اگر بہت مال چھوڑ رہا ہو تو وہ رفاہِ عام کے کاموں کے لیے بھی وصیّت کرنے کا مجاز ہے۔ کیونکہ مذکورۂ بالا آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ وصیّت کی اجازت صرف والدین اور رشتہ داروں تک ہی محدود رہے۔[۲۸]

وصیّت اور میراث کے اس قانون سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ شخصی املاک کے ترکوں کے معاملہ میں اسلامی اسکیم یہ ہے کہ دو تہائی تو لازماً قانونِ میراث کے مطابق تقسیم ہو، اور ایک تہائی مرنے والے کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جس غرض کے لیے چاہے اسے صرف کرنے کی وصیت کر دے۔ بشرطیکہ وہ جائز طریقے پر ہو، یعنی وہ کام بھی جائز ہو

---

[۲۸] نیل الاوطار، ج ۶، ص ۴۲-۴۳۔ اس معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشریح سے قرآن کا جو منشا معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے لیے اپنے رشتہ داروں کو غریب و محتاج چھوڑ کر رفاہِ عام پر خرچ کرنے کی وصیت کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ نیل الاوطار میں بخاری، مسلم اور دوسری کتبِ حدیث سے آنحضرتؐ کے جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ "تیرا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں اس حال میں چھوڑے کہ وہ محتاج ہوں اور لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں"۔

جس کے لیے وصیت کی گئی ہے اور اس میں کسی کی حق تلفی بھی نہ ہو۔[۲۹]

۲۰۔ نادان لوگوں کے مفاد کی حفاظت | جو لوگ خفیف العقل ہونے کی وجہ سے اپنی املاک میں صحیح تصرف نہ کر سکتے ہوں اور ان کو ضائع کر رہے ہوں، یا بجا طور پر اندیشہ ہو کہ ضائع کر دیں گے، ان کے بارے میں قرآن ہدایت کرتا ہے کہ ان کی املاک ان کے اختیار میں نہ دی جائیں بلکہ وہ ان کے سرپرست یا قاضی کے انتظام میں رہیں اور انہیں صرف اُس وقت سونپی جائیں جب اس امر کا اطمینان ہو جاتے کہ وہ اپنے معاملات کو ٹھیک طرح سنبھال سکیں گے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (۴: ۵-۶)

اور اپنے اموال جنہیں اللہ نے تمہارے لیے زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالہ نہ کرو۔ البتہ انہیں اس میں سے کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے معقول بات کرو۔ اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں اور تم ان میں ہوشمندی محسوس کرو تو ان کے مال ان کے حوالہ کر دو۔

اس آیت میں ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ شخصی املاک اگرچہ اُن اشخاص ہی کی مِلک ہیں جو اُن پر قانوناً حقِ ملکیت رکھتے ہوں، لیکن وہ بالکلیہ انہی کی نہیں ہیں، بلکہ اُن کے ساتھ اجتماعی مفاد بھی وابستہ ہے۔ اسی بنا پر قرآن اَمْوَالَهُمْ (ان کے مال) کہنے کے بجائے اَمْوَالَكُمْ (تمہارے مال)

---

[۲۹] وصیت کے قانون کی تشریح کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حقِ وصیت پر تین حدود عائد کیے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ اپنے ایک تہائی مال کی حد تک وصیت کے اختیارات استعمال کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں کو ازروئے قانون وراثت کا حصہ پہنچتا ہو ان کے لیے کوئی وصیت دوسرے وارثوں کی رضامندی کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ تیسرے یہ کہ کسی وارث کو وراثت سے محروم کرنے یا اس کے حصہ میں کمی کرنے کی وصیت نہیں کی جا سکتی۔ نیل الاوطار، ج ۶ صفحہ ۳۱-۳۵۔

کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اور اسی بنیاد پر وہ سربرستوں اور قاضیوں کو یہ اختیار دیتا ہے کہ جہاں شخصی املاک میں بے جا تصرف سے معاشرے کا اجتماعی نقصان کیا جا رہا ہو، یا ایسے نقصان کا معقول اندیشہ ہو، وہاں مالک کے حقِ ملکیت اور حقِ انتفاع کو برقرار رکھتے ہوئے اس کا حقِ تصرف اپنے ہاتھ میں لے لیں۔[۳۰]

۲۱۔ سرکاری املاک میں اجتماعی مفاد کا لحاظ: جو جائدادیں اور اموال اور آمدنیاں حکومت کی ملک ہوں، ان کے بارے میں قرآن ہدایت کرتا ہے کہ ان کا صرف محض دولت مند طبقوں کے مفاد میں نہیں بلکہ عام لوگوں کے مفاد میں ہونا چاہیے، اور خصوصیت کے ساتھ ان کے صرف میں معاشرے کے کمزور طبقات کی بھلائی کا زیادہ لحاظ رکھا جانا چاہیے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ... لِلْفُقَرَآءِ الْمُھٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ ... وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ .... وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِھِمْ (۵۹: ۷-۱۰)	جو کچھ پھیر دے اللہ اپنے رسول کی طرف بستیوں کے لوگوں سے وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے[۳۱] اور قرابت داروں کے لیے[۳۲] اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافر کے لیے، تاکہ یہ مال صرف تمہارے مال داروں ہی میں چکر نہ لگاتا رہے... نیز وہ ان غریب مہاجرین کے لیے بھی ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال دیے گئے ہیں ... اور وہ ان انصار کا حق بھی ہے جو مہاجرین

۳۰۔ ابن العربی، احکام القرآن، ج ۱، ص ۱۳۳۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۴۵۲۔ الجصاص، احکام القرآن، ج ۲، ص ۷۲، ۷۳۔

۳۱۔ اس سے مراد اسلامی ریاست کے نظم و نسق اور دفاع کے مصارف ہیں۔ اسی مد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء اپنا گزارہ لیتے تھے اور اپنے عمال (باستثناء عاملینِ زکوٰۃ) کی تنخواہیں بھی دیتے تھے۔

۳۲۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۲۰۔

کے آنے سے پہلے ایمان کے ساتھ دارالاسلام میں مقیم تھے ... اور اس میں بعد کے آنے والوں کا حق بھی ہے۔

۲۲۔ ٹیکس عائد کرنے کے متعلق اسلام کا اصولی ضابطہ | ٹیکس عائد کرنے کے بارے میں قرآن اس اصول کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ٹیکسوں کا بار صرف اُن لوگوں پر پڑنا چاہیے جو اپنی ضرورت سے زیادہ مال رکھتے ہوں، اور ان کی دولت کے بھی صرف اس حصے پر یہ بار ڈالا جانا چاہیے جو ان کی ضرورت سے زائد بچتا ہو:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲: ۲۱۹)

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے بچے۔

اسلامی نظامِ معیشت کی خصوصیات | قرآن کے اِن ۲۲ نکات میں انسان کی معاشی زندگی کے لیے جو اسکیم مرتب کی گئی ہے اس کے بنیادی اصول اور نمایاں خصائص یہ ہیں:

۱۔ اس میں معاشی اَقدار کو اخلاقی اَقدار سے الگ رکھنے کے بجائے ان کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا ہے اور معیشت کے مسائل کو مجرّد معاشی نقطۂ نظر سے لے کر حل کرنے کے بجائے انہیں اس مجموعی نظامِ حیات کے تناسب میں رکھ کر حل کیا گیا ہے جس کی عمارت اسلام نے کلیتہً خدا پرستانہ تصورِ کائنات و فلسفۂ اخلاق پر استوار کی ہے (نکات ۱، ۲، ۴، ۵)

۲۔ اس میں زمین کے معاشی وسائل و ذرائع کو نوعِ انسانی پر خدا کا فضلِ عام قرار دیا گیا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ شخصی، گروہی یا قومی اجارہ داریوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور اس کے بجائے خدا کی زمین پر بنی نوع الانسان کو اکتساب رزق کے زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک کھلے مواقع دیئے جائیں (نکتہ ۵)۔

۳۔ اس میں افراد کو شخصی ملکیت کا حق دیا گیا ہے مگر غیر محدود نہیں۔ فرد کے حق ملکیت پر دوسرے افراد اور معاشرے کے مفاد کی خاطر ضروری پابندیاں عائد کرنے کے ساتھ یہ اسکیم ہر فرد

کے مال میں اس کے اقربا، ہمسایوں، دوستوں، حاجت مند اور کم نصیب انسانوں، اور مجموعی طور پر پورے معاشرے کے حقوق بھی قائم کرتی ہے۔ ان حقوق میں سے بعض جبری طور پر قابلِ تنفیذ ہیں اور بعض کو سمجھنے اور ادا کرنے کے لیے خود افراد کو ذہنی و اخلاقی تربیت کے ذریعہ سے تیار کرنے کا انتظام کیا گیا ہے (نکات ۳، ۵، ۷ تا ۱۵، ۱۷، ۱۹، ۲۰)۔

۴۔ انسانی زندگی کے معاشی نظام کو چلانے کی فطری صورت اس اسکیم کی رُو سے یہ ہے کہ افراد اسے آزادانہ سعی و جہد کے ذریعہ سے چلائیں اور ترقی دیں۔ لیکن یہ آزادانہ سعی و جہد اس میں بے قید نہیں رکھی گئی ہے، بلکہ معاشرے کی اور خود ان افراد کی اپنی اخلاقی و تمدنی اور معاشی بھلائی کے لیے اسے بعض حدود سے محدود کیا گیا ہے (نکات ۶، ۷۔ ۱۵، ۲۲)۔

۵۔ اِس میں عورت اور مرد دونوں کو ان کی کمائی ہوئی اور میراث یا دوسرے جائز ذرائع سے پائی ہوئی دولت کا یکساں مالک قرار دیا گیا ہے اور دونوں صنفوں کو اپنے حقِ ملکیت سے متمتع ہونے کے یکساں حقوق دیئے گئے ہیں (نکات ۳، ۴، ۱۸)۔

۶۔ اِس میں معاشی توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک طرف تو لوگوں کو بخیلی اور رہبانیت سے روک کر خدا کی نعمتوں کے استعمال پر اُبھارا گیا ہے، اور دوسری طرف انہیں اِسراف و تبذیر سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے (نکات ۵، ۸ تا ۱۰)۔

۷۔ اِس میں معاشی انصاف قائم کرنے کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ دولت کا بہاؤ نہ تو غلط ذرائع سے کسی خاص سمت میں چل پڑے اور نہ جائز ذرائع سے آئی ہوئی دولت کہیں ایک جگہ سمٹ کر بے کار رُکی رہ جائے۔ اس کے ساتھ وہ یہ انتظام بھی کرتی ہے کہ دولت زیادہ سے زیادہ استعمال اور گردش میں آئے اور اس کی گردش سے خصوصیت کے ساتھ اُن عناصر کو حصّہ ملے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنا مناسب حصّہ پانے سے محروم رہ جاتے ہوں (نکات ۶ تا ۱۰، ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۰ تا ۱۹، ۲۱)۔

۸۔ یہ اسکیم معاشی انصاف قائم کرنے کے لیے قانون اور ریاست کی مداخلت پر زیادہ انحصار

نہیں کرتی۔ چند ناگزیر تدابیر کو ریاست کی ذمہ داری قرار دینے کے بعد وہ اس مقصد کے لیے اپنی بقیہ تدابیر کا نفاذ افراد کی ذہنی و اخلاقی تربیت اور معاشرے کی اصلاح کے ذریعہ سے کرتی ہے تاکہ آزاد سعی وجہد کی معیشت کے منطقی تقاضوں کو برقرار رکھتے ہوئے معاشی انصاف کا مقصد حاصل ہو سکے (نکات ۵ تا ۲۲)

۹۔ معاشرے کے مختلف عناصر میں طبقاتی کشمکش پیدا کرنے کے بجائے وہ اس کے اسباب کو ختم کر کے ان کے درمیان تعاون اور رفاقت کی روح پیدا کرتی ہے (نکات ۴، ۹ تا ۱۱، ۱۲، ۱۵ تا ۱۷، ۲۱، ۲۲)۔

یہ اصول نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں جس طرح عملاً ریاست اور معاشرے کے نظام میں نافذ کیے گئے تھے اس سے ہم کو احکام اور نظائر کی شکل میں بہت سی مزید تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بحث اِس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔ اس کے متعلق حدیث، فقہ، تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں وسیع مواد موجود ہے جس کی طرف تفصیلات کے لیے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

فہرست مآخذ

قرآنِ حکیم۔

بیضاوی، انوار التنزیل، مصطفی البابی حلبی، مصر، ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء)،

آلوسی، روح المعانی۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۵ھ

الجصاص، احکام القرآن، مطبعۃ البہیہ، مصر، ۱۳۴۷ھ

ابن العربی، احکام القرآن، مطبعۃ السعادہ، مصر ۱۳۳۱ھ

ابن جریر، جامع البیان، مطبعۃ الامیریہ، مصر، ۱۳۲۸ھ

ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مطبعۃ مصطفیٰ محمد، مصر، ۱۹۴۷ء
الزمخشری، الکشاف، المطبعۃ البہیہ، مصر، ۱۳۴۳ھ
البخاری، صحیح
مسلم، صحیح
ابوداؤد، سنن
الترمذی، سنن
النسائی، سنن
ابن ماجہ، سنن المصطفیٰ
الشوکانی، نیل الاوطار، مصطفیٰ البابی، مصر، ۱۳۴۷ھ
ابن عبدالبر، الاستیعاب، دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۳۷ھ
ابن منظور، لسان العرب، بیروت، ۱۹۵۶ء

اِسلام کا مفہوم

از روئے لغت و قرآن

(از نثار احمد ایم۔اے۔ معاون ادارہ معارف اسلامی۔ کراچی)

انسان یوں تو خواہشات کا پتلا ہے۔ اور اس کی احتیاجات و ضروریات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بنیادی طور پر انسانی زندگی کی ضروریات دو قسم کی ہو سکتی ہیں۔ ایک مادی جیسے کھانے کے لیے غذا، رہنے کے لیے جگہ اور پہننے کے لیے لباس وغیرہ۔ اور دوسری روحانی یعنی غیر مادی جو انسان کی ہدایت، اس کی قلبی تسکین اور اس کے ذہنی اطمینان کے لیے ناگزیر ہیں، یعنی حقیقت کا علم، زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ[1] تمدن کے اصول، اخلاقی اقدار وغیرہ۔ خالقِ حقیقی نے انسان کی ان دونوں ضروریات کی تسکین کا پورا پورا انتظام فرمایا ہے[2]۔ ایک طرف تو انسان کی مادی احتیاجات کے لیے زمین و آسمان کی ساری قوتیں اس کی خدمت گزار ہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ اس کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اور تمام ظاہری و باطنی نعمتیں اس پر تمام کر دی گئی ہیں:

---

[1] "دنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے بہر حال ایک طریقِ زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ انسان دریا نہیں ہے جس کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے خود متعین ہو جاتا ہے۔ انسان درخت نہیں ہے جس کے لیے قوانینِ فطرت ایک راہ طے کر دیتے ہیں۔ انسان نرا جانور نہیں ہے جس کی رہنمائی کے لیے تنہا جبلت ہی کافی ہو جاتی ہے . . . . وہ زندگی کے بے شمار پہلو رکھتا ہے۔ شخصی، عائلی، معاشی، سیاسی، ملکی، بین الاقوامی وغیرہ جن کے لیے بہر طور ایک راہ ضروری ہے۔"

(اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات۔ از ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۶۲۔ لاہور ۱۹۶۲ء)

[2] ملاحظہ ہو البقرہ، آیات ۲۱ تا ۲۳۔ ۲۱۱۔ ۲۳۱۔ ابراہیم، آیت ۳۴۔ اعراف آیت ۵۴۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۔ (لقمان ۔ آیت ۲۰)	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔
وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (ابراہیم ۔ آیت ۳۴)	اور جو کچھ تم نے مانگا وہ اس نے تم کو دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لا سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

دوسری طرف اس کی روحانی ضروریات کی تکمیل کے لیے اُس ذاتِ مطلق نے اپنے انبیاء و رسُل کو مبعوث فرمایا، اور انہیں اپنی طرف سے کتبِ ہدایت اور قوانینِ حیات سے سرفراز کیا، اور ان کو ایسا ضابطۂ حیات (CODE OF LIFE) دیا جو ہر قدم پر انسان کی ٹھیک ٹھیک رہنمائی کر سکے یہی وہ ہدایت ہے جس کا وعدہ حضرت آدم علیہ السّلام کو دنیا میں بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی سے فرمایا تھا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (البقرہ آیت ۳۸)	جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت[۳] پہنچے تو اس کی پیروی کرنا کہ جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

سورۂ قصص میں ہے:

---

[۳] یہاں ہدایت کے مفہوم میں کتاب اور رسول دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں: "هُدًى، کتاب و رسول (فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ) الكتاب والرسول" (تنویر المقباس من تفسیر ابنِ عباس۔ ص ۶۔ لابی طاہر محمد بن یعقوب الفیروزآبادی المتوفی ۸۱۷ھ۔ الطبعۃ الثانیہ ۱۳۷۰ھ مصر)

فَیَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ وَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ (آیت ۴۷)

(اور اے پیغمبر ہم نے تم کو اس لیے بھیجا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اگر ان لوگوں پر ان کے اپنے کیے کرتوتوں کی بدولت کوئی مصیبت آئے تو) وہ یہ کہنے لگیں کہ اے پروردگار تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا کہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے اور ایمان لانے والوں میں ہوتے[4]۔

زندگی گزارنے کا جو صحیح طریقہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور اپنی کتابوں کے ذریعے انسان کو بتایا ہے اس کا نام اسلام ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام "درحقیقت اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے" (آل عمران : ۱۹)۔ لہٰذا اس دین اور اس کی حقیقت کو جاننا ہمارے لیے نہایت ضروری ہے اور اس کو جاننے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ ہم لفظ "اسلام" کے معنی و مفہوم سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔

لغوی تحقیق اسلام کا مادّہ (س ل م) ہے۔ یہ سَلْم اور سِلْم دونوں طرح مستعمل ہے[5]۔ اس کے ابتدائی و اساسی مفہوم میں عجز و انکسار اور تذلل و خضوع داخل ہے اور کلامِ عرب میں یہ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دو معنی خاص ہیں:

(۱) اس کے ایک معنی ہیں اطاعت، فرمانبرداری، انقیاد، تسلیم و رضا، سپردگی، امتثالِ امر، حکم ماننا، قبول کرنا، منظور کرنا، جھک جانا، دستبردار ہو جانا، سونپنا[6]۔ عربی کی مشہور و معروف

---

[4] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ التوبہ، آیت ۴۳۔ النساء آیت ۱۳۶۔ یونس ۷۴۔ روم آیت ۴۷۔ شوریٰ آیت ۵۱، نساء آیت ۱۷۔

[5] لسان العرب (ابن منظور الافریقی۔ بولاق ۱۳۰۳ھ) میں ہے۔ السلم والسلم ۔۔۔ یفتح و یکسر ویذکر و یونث (ج ۱۵ ص ۱۸۴) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے۔ جمہرۃ اللغۃ ابن درید۔ ج ۳ ص ۴۹۔

[6] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: لسان العرب ج ۱۵ ص ۱۸۵ - ۱۸۷، تاج العروس (مرتضیٰ زبیدی)

لغت "لسان العرب" میں ہے:

والسّلم الاسلام، والسَّلمُ الاستخذاءُ والانقیاد والاستسلام (ج ۱۵ ص ۱۸۷)	سِلم اسلام اور سَلم کے معنی ہیں اطاعت اور فرمانبرداری۔

دوسری جگہ ہے:

والاسلام والاستسلام الانقیاد (ج ۱۵ ص ۱۸۵) اسلام اور استسلام کے معنی فرمانبرداری کے ہیں۔

اسی طرح تاج العروس میں ہے:

والسلم مثل السلام والاسلام والمراد هنا الاستسلام والانقیاد	اور سلم سلام اور اسلام ہم معنی ہیں اور یہاں اس سے مراد انقیاد و اطاعت ہے۔

اسی میں دوسری جگہ ہے۔ والسلم الاستسلام والاستخذاء والانقیاد ومنه قوله تعالیٰ القوا الیکم السلم ای الانقیاد۔ (ج ۸۔ ص ۳۴۲) یعنی "سلم سے مراد ہے جھک جانا، مطیع ہو جانا، اور تابع فرمان ہو جانا۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ القوا الیکم السلم یہاں سَلَم بمعنی اطاعت ہے۔" عربی کے مشہور شاعر امرؤ القیس بن عالس کا شعر ہے ؎

فلست مبدّلا باللہِ ربّاً ولا مستبدلًا بالسّلمِ دینا

(یعنی میں نہ تو اللہ کے بجائے کسی اور کو اپنا رب بناؤں گا اور نہ سَلم (یعنی اسلام) کو کسی اور دین سے بدلوں گا)

اسی طرح کندہ کا ایک جاہلی شاعر کہتا ہے ؎

دعوتُ عشیرتی للسّلمِ لمّا رأیتهم تولّوا مُدبرینا

ج ۸ ص ۳۴۲)، القاموس المحیط (الفیروز آبادی) مصر ۱۳۴۴ھ طبع دوم ج ۴ ص ۱۲۹)، اساس البلاغہ (زمخشری قاہرہ طبع اوّل ۱۳۴۱ھ ص ۲۱۸)، لغات القرآن (عبدالرشید نعمانی دہلی ۱۹۴۸ء ج ۳ ص ۱۲۶)، جامع العلوم الملقب بہ دستور العلماء (قاضی عبدالنبی۔ دکن طبع اوّل ج ۱ ص ۱۸۰)، وغیرہ۔

(میں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو فرمانبرداری کی طرف بلایا جب میں نے ان کو دیکھا کہ انھوں نے ہم سے پیٹھ پھیرلی ہے[7])

ایک اور جگہ تاج العروس میں ہے کہ: والسلم الاسم من التسلیم وھو بذل الرضا بالحکم (ج ۸ ص ۳۴۲) یعنی "سلم نام ہے تسلیم کا یعنی حکم کی بجا آوری میں پوری طرح سے راضی ہونا"

اسی لیے جو شخص مطیع و منقاد ہو جائے اس کے متعلق کہا جاتا ہے اَسْلَمَ الرَّجُلُ یعنی اس شخص نے اطاعت و فرمانبرداری قبول کرلی۔ وہ رام ہوگیا۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مامن آدمیٍ الّا ومعہٗ شیطان، قیل ومعک؟ قال نعم! ولکن اللہ اعاننی علیہ فَاَسْلَمَ[8] (کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ شیطان نہ لگا ہو۔ لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا آپ کے ساتھ بھی؟ فرمایا ہاں لیکن اللہ نے اس کے مقابلہ پر میری مدد کی اور وہ میرا تابع ہوگیا"

اَسْلَمَ کا لفظ جب بلا صلہ آئے تو اس کے معنی اطاعت و انقیاد کے ہوتے ہیں۔ الیٰ کے صلے کے ساتھ آئے تو اس کے معنی سپرد کر دینے اور لام کے صلہ کے ساتھ آئے تو اس کے معنی جھک جانے کے ہیں۔ قریش کے لوگوں نے بنی ہاشم کے خلاف مقاطعہ کا جو فیصلہ کیا تھا اس میں یہ طے کیا تھا کہ لا یناکحوھم ولا یبایعوھم حتیٰ یُسْلِمُوا الیھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی وہ ان کے ساتھ شادی بیاہ اور خرید و فروخت کا کوئی تعلق نہ رکھیں گے جب تک کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے نہ کر دیں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا یطھر اللہ قلب عبد حتی یُسلِم لنا ویکون سلماً لنا۔

اللہ تعالیٰ کسی بندے کا دل اس وقت تک پاک نہیں کرتا جب تک کہ وہ ہمارا تابع فرمان نہ ہو جائے اور ہم سے مل کر (موافقت سے) نہ رہے[9]۔

---

[7] لسان العرب (ج ۱۵ ص ۱۸۵)، تاج العروس (ج ۸ ص ۳۴۲)

[8] تاج العروس (ج ۸ ص ۳۴۰)، لغات الحدیث (وحید الزمان۔ کراچی ۱۹۵۶ء۔ ج ۲ ص ۱۴۴)

[9] لغات الحدیث ج ۲ ص ۱۴۳۔

پھر اسی سپردگی اور اطاعت و فرمانبرداری کی وجہ سے قید و بند اور اسیری کے معنی پیدا ہوئے۔ چنانچہ رَجُلٍ سَلِم کے معنی ہونگے "قیدی"[10]، کیونکہ وہ مغلوب ہوتا ہے اور دوسرے کے سامنے سر اطاعت خم کر دیتا ہے۔ اخذہٗ سلماً اس وقت بولتے ہیں جب کسی کو بغیر جنگ کے گرفت میں لے لیا اور رکھ لیا جائے[11]۔ لاتینک برجلٍ سلِم کے معنی ہونگے "میں ایک آدمی کو گرفتار کرکے آپ کے پاس لاؤں گا"[12]۔

اسی سے باب تفعیل میں سَلَّمَ یُسَلِّمُ تَسْلِیمًا ہے، جس کے معنی قبول کرنے، بچانے، سپرد کرنے اور انقیاد و اذعان کے ہیں۔ سَلَّمَ بہ کے معنی ہیں کسی بات کو مان لینا، قبول کرنا، منظور کرنا[13]۔ اسی سے بیع سَلَم بھی ہے جس میں کسی چیز کی پیشگی قیمت بائع کے حوالے کی جاتی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے مَنْ تَسَلَّمَ فی شیئٍ فلا یصرفہ الیٰ غیرہ، یعنی جو شخص کسی مال کے معاملہ میں پیشگی قیمت وصول کرے وہ پھر اس کو بدل کر دوسرا مال نہ دے (مثلاً گیہوں دینا ٹھیرے اور چاول دے دے[14])

تَسَلَّمَ۔ کے معنی ہوتے ہیں لے لینا۔ وصول کرنا اور مسلمان ہونا[15]۔ سَلَّمْتُمْ کے معنی ہونگے تم نے حوالے کر دیا، تم نے سپرد کر دیا، تم نے سونپ دیا۔ یہ "تسلیم" سے ماضی کا صیغہ ہے جس کے معنی سپرد کرنے کے آتے ہیں[16]۔ ایک حدیث میں ہے انی وھبت لخالتی غلاماً فقلت لھا لاتسلمیہ حجاماً وَلاصائغاً وَلاقصاباً۔ یعنی میں نے اپنی خالہ کو ایک غلام ہبہ کیا اور کہہ دیا کہ اس کو حجام اور سنار اور قصاب کے سپرد نہ کرنا۔ (یعنی یہ تینوں پیشے اس کو نہ سکھانا اور دوسرے پیشے سکھاؤ تو قباحت نہیں)[17]

اسی سے باب افعال میں "اسلام" ہے۔ اس کے معنی ہیں اطاعت، فرمانبرداری، گردن رکھ

---

[10] رجل سلم ای اسیر لانہ استسلم وانقاد (لسان العرب ج ۱۵ ص ۱۰۵، تاج العروس ج ۸ ص ۳۳۷)

[11] تاج العروس ج ۸ ص ۳۳۰ [12] لغات الحدیث ج ۲ ص ۱۴۴

[13] وسلّم بہ — رضی (محیط المحیط ج ۱ ص ۹۸۶ – ۹۸۹)

[14] لغات الحدیث ج ۲ ص ۱۴۶ [15] ایضاً

[16] لغات القرآن۔ ج ۳ ص ۲۰۶

[17] لغات الحدیث ج ۲ ص ۱۴۴

دینا، تابعدار بن جانا اور اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔[۸] یہی معنی باب استفعال سے اِستَسلَمَ یا استسلام کے ہیں[۹]۔ اسلام کا اسم فاعل مُسلِم ہے یعنی اسلام میں داخل ہونے والا، اسلام قبول کرنے والا۔ اپنے آپ کو احکامِ الٰہی کے تابع کر دینے والا۔ "امتِ مسلمہ" یعنی وہ گروہ جو اللہ کی اطاعت کرنے والا ہے۔ احکام خداوندی کو تسلیم کرتا ہے۔

——— دوسرے مشہور معنی صلح، آشتی، امن و عافیت اور حفاظت و پناہ

---

[۸] ملاحظہ ہو: لسان العرب (ج ۱۵ ص ۱۸۵)، تاج العروس (ج ۸ ص ۳۴۰)، قاموس المحیط (ج ۴ ص ۱۲۹-۱۳۱)۔ کتاب دائرۃ المعارف (بستانی۔ بیروت ۱۸۷۸ء ص ۶۰۵)، دائرۃ المعارف القرن الرابع عشر العشرین (فرید وجدی مصر ج ۱ ص ۳۲۸ مصر ۱۹۳۷ء)، کتاب کشاف اصطلاحات الفنون (شیخ محمد اعلیٰ تھانوی کلکتہ ۱۸۶۲ء) مغربی محققین بھی اس لفظ کے یہی معنی بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

— THE ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM. VOL. II (E-K) LEYDEN & LONDON 1927

— ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS.

EDITED BY JAMES HASTINGS. VOL. VII. N.Y. 1940

— AN ARABIC ENGLISH LEXICON BY GEORGE PERCY BADGE. LONDON. 1881

— THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY. OXFORD 1933

— THE SHORT OXFORD ENGLISH DICTIONARY LONDON & EDIN. 1959.

[۹] لسان العرب میں ہے: والاسلام والاستسلام الانقیاد والاسلام من الشریعۃ اظہار الخضوع واظہار الشریعۃ والتزام لما اتی بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ج ۱۵ ص ۱۸۱)، (یعنی اسلام و استسلام کے معنی انقیاد کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں جھک جانے اور اسلامی احکام پر عمل کرنے اور جو کچھ حضور لیکر آئے اسے مضبوط پکڑے رکھنے کا نام ہے)۔ استسلم۔ انقاد (تاج العروس ج ۸ ص ۳۴۰) کنز العلوم واللغۃ۔ فرید وجدی مصر ۱۳۲۳ھ ص ۵۶۲) الاستسلام الانقیاد والطاعۃ (اقرب الموارد وذیلہ)، راغب نے المفردات فی غریب القرآن (مصر ۱۹۶۱ء ص ۲۴۱)، توفی مسلما کے تحت لکھا ہے ای اجعلنی ممن استسلم لرضاک۔

کے ہیں[۳۹]۔ اور یہ لڑائی (حَرْب) کی ضد ہے[۴۰]۔ ایک حدیث میں ہے[۴۱] اَسْلِمْ تَسْلَمْ یعنی اسلام لا تو تباہی سے بچ جائے گا۔ ایک مرتبہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جعلہ مسلما لمن دخلہ (جو بھی اس (اسلام) میں داخل ہوا وہ سلامت رہا یا محفوظ رہے گا) ایک اور حدیث میں ہے: وانّ سِلْمَ المومنین واحدٌ لا یُسالَمُ مومن دون مومنٍ (مومنوں کی صلح سب مل کر ایک ہونی چاہیے یہ نہیں کہ ایک مومن سے صلح ہو اور دوسرے سے نہ ہو۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا المُسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ (ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے کہ نہ تو اس پر ظلم کرے اور نہ دشمن کے ہاتھ میں چھوڑ دے۔ (اور اس کا بچاؤ یا حفاظت نہ کرے)۔ ایک موقع پر: انہ اخذ ثمانین من اھلِ مکۃ سِلْمًا او سَلَمًا (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں میں سے ۸۰ آدمیوں کو صلح کے طور پر لے لیا[۴۲] سِلْمًا اور سَلَمًا دونوں کے معنی صلح کے ہیں۔

لسان العرب میں ہے:

والسلم المسالم فقول انا سلم لمن ... سلم صلح کرنے والے کو کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاتا

---

۴۰ لسان العرب میں ہے: والسّلم والسّلام کالسّلم وقد سالمہ مسالمۃ وسلامًا۔ قال ابوکبیر الھذلی ھا جوا لقومھم السّلام کانّھم لما اصیبوا اھل دین محتر (ج ۱۵ ص ۱۸۵) تاج العروس میں ہے: والسّلم۔ الصلح (ج ۸ ص ۳۴۲)، امام راغب کے الفاظ: والسلم والسلام والسلم۔ الصلح[۲۴۰]۔ فرید وجدی لکھتے ہیں: (سلم)، من العیب یسلم سلامۃ۔ نجا وسلمہ اللّٰہ۔ نجاہ۔ والسلم۔ الصلح (کنز العلوم واللغۃ ص ۵۶۲، ۵۶۳)۔ والسّلم۔ الصلح۔ (القاموس المحیط۔ ج ۴ ص ۱۲۹) سلم من الآفات (المعرب فی ترتیب المعرب۔ علی المطرزی دکن ۱۳۲۸ھ ص ۲۶۳)۔ السلم والسلم۔ الصلح۔ یفتح ویکسر و یذکر ویؤنث (لسان العرب ج ۱۵ ص ۱۸۴) وحکی السِّلم السَّلم الاستسلام (طلب سلامتی)۔ لسان العرب ج ۱۰ ص ۱۸۵

۴۱ السلم والسلم وقد قرئ علی ثلاثۃ اوجہ والسلم ضد الحرب ومنہ اشتقاق السلامۃ (جمھرۃ اللغۃ ج ۳ ص ۹۴)۔ السِّلم والسَّلم۔ ضد الحرب (تاج العروس ج ۸ ص ۳۳۷)

۴۲ یعنی جنگ کر کے ان کو قید نہیں کیا بلکہ مکہ والوں کی رضامندی سے ان کے اسّی آدمیوں کو بطور یرغمال اپنے پاس رکھ لیا۔ لغات الحدیث ج ۲ ص ۱۴۴)

سالمنی وقوم سلم وسلم سالمون وکذالك .... تسالموا وتصالحوا (ج ۱۵ ص ۱۸۵)	ہے کہ میں صلح کرنے والا ہوں اس شخص سے جو مجھ سے صلح کرے۔ اور قوم سلم صلح جو قوم کو کہتے ہیں اور اسی طرح سے .... تَسَالَمُوْا کا لفظ تصالحُوْا کا ہم معنیٰ ہے یعنی آپس میں مصالحت کرنا۔

اسی سے موافقت و مطابقت کے معنی پیدا ہوتے۔ چنانچہ جب گھوڑے پاؤں ملاکر ایک ساتھ چلیں تو کہتے ہیں تسالمت الخیل۔[۲۳]

پھر اسی سے باب سَمِعَ یَسْمَعُ میں سَلِمَ یَسْلَمُ آتا ہے جس کے معنی خالص اور پورے طور پر کسی دوسرے کے لیے ہو جانے کے ہیں[۲۴]۔ اسی سے علیحدہ رہنے اور محفوظ و مامون رہنے کے معنی آتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (بخاری) یعنی اصلی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ (مطلب یہ ہے کہ اس کے بُرے افعال سے امن میں رہیں[۲۵])،

سَلَّمَ الشئ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو کسی کے لیے خالص کر دینا، اُس کے حق میں محفوظ کر دینا[۲۶]۔ سَلِمَ لہٗ کے معنی کسی کے لیے مخصوص ہونے کے ہیں۔ اور جب سَلِمَ مِنْ ہو تو اس کے معنی نجات پانے اور بری ہونے کے ہوں گے۔ چنانچہ اسی سے سَلِمَ من الخَطَر یعنی خطرہ سے حفاظت اور سَلِمَ من العیب یعنی عیب و بُرائی سے محفوظ رہنے کے ہیں[۲۷]۔ چنانچہ قرآن کی آیت وَالسَّلَامُ عَلٰی

---

[۲۳] والخیل اذا تسالمت تسایرت لا یہیج بعضہا بعضاً (لسان العرب۔ ج ۱۵ ص ۱۸۵)

[۲۴] لغات القرآن۔ ج ۳ ص ۱۲۶

[۲۵] لسان العرب ج ۱۵، ص ۱۸۶

[۲۶] لسان العرب میں ہے سَلَّمَ الشئ لفلان ای اخلصہ وسلّم لہٗ ای خلص لہٗ (ج ۱۰ ص ۱۸۶)

[۲۷] وَسَلِمَ من الآفۃ بالکسر سلامۃً وسلاماً نجا (اساس البلاغہ زمخشری ص ۲۱۸)، سَلِمَ من البلاد سلاماً وسلامۃً (تاج العروس ج ۸ ص ۳۴۰-۳۴۳)

من اتبع الھدیٰ کے معنی یہ ہیں کہ جس نے ہدایت الٰہی کا اتباع کیا وہ (اللہ کے عذاب اور اس کی پکڑ سے محفوظ رہا۔[۲۸] سَلَامٌ کے معنی ایک طرف امن و عافیت اور آفات سے محفوظ رہنے کے ہیں اور دوسری طرف یہ لفظ عیوب و نقائص سے پاک ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے۔[۲۹] اسی معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام السَّلام بھی ہے۔ سلامٌ کے معنی کسی کے حق میں سلامتی کی دُعا کرنے اور سلام کرنے کے بھی آتے ہیں۔ جب سَلَّمَ عَلیٰ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی سلام کرنے کے ہوتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ یُسَلِّم الصغیر علی الکبیر "چھوٹا بڑے کو سلام کرے" قرآن میں ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے:

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا۔ (نور۔ آیت ۲۷)	مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے (لوگوں کے) گھروں میں گھر والوں سے اجازت لے اور ان کو سلام کیے بغیر داخل نہ ہوا کرو۔

قرآن میں استعمالات | سَلْم اور سِلْم اور اس کے مشتقات کا استعمال قرآن کریم میں کثرت سے ہوا ہے۔ ان استعمالات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ کسی صلہ کے ساتھ

۲۔ بغیر کسی صلہ کے

صلہ کے ساتھ استعمال کے مواقع پر جو معنی ہونگے ان کی تعیین اس کے صلات کو دیکھ کر بآسانی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے:۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَهٗ وَھُوَ مُحْسِنٌ	ہاں جو شخص خدا کے آگے گردن جھکا دے اور وہ

---

[۲۸] والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ معناہ ان من اتبع ھُدَی اللّٰہ سَلِمَ من عذابہ وسخطہ (لسان العرب السّلم۔ السلامۃ التعرّی من الآفات الظاھرۃ والباطنۃ (المفردات۔ راغب ص ۲۳۹)

[۲۹] السّلام والسلامۃ۔ البرأۃ۔ السلامۃ۔ العافیۃ (لسان العرب ج ۱۰ ص ۱۸۴، ۱۸۵) والسلام فی الاصل السلامۃ وھی برأۃ من العیوب (تاج العروس ج ۸ ص ۳۳۸)

فَلَہٗۤ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ ۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ (آیت ۱۱۲)

نیکوکار بھی ہو تو اس کا اجر اس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو (قیامت کے دن) نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے[۳۰]

اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (بقرہ۔ آیت ۱۳۱ پ ۱)

جب ان (ابراہیمؑ) سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ جھک جاؤ تو انہوں نے کہا میں رب العٰلمین کے آگے سرِ اطاعت خم کرتا ہوں[۳۱]۔

ان دونوں جگہوں پر اسلام کے معنی اطاعت و فرمانبرداری اور جھک جانے کے ہیں۔ اس لیے کہ ان میں صلہ ل آیا ہے۔ اور پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اس لفظ کے بعد جب صلہ لام ہو تو اس کے معنی اطاعت و فرمانبرداری ہی ہوتے ہیں۔

اسی طرح سورۂ مومن میں ارشاد ہے:

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

(پ ۲۴ مومن۔ آیت ۶۶)

(اے محمدؐ ان سے) کہدو کہ مجھے اس بات کی ممانعت کی گئی ہے کہ تم لوگ جن کو خدا کے سوا پکارتے ہو ان کی پرستش کروں جبکہ میرے پاس میرے پروردگار (کی طرف) سے کھلی دلیلیں آچکی ہیں اور مجھ کو حکم ہوا ہے کہ پروردگار عالم ہی کا تابع فرمان رہوں۔

اور سورۂ بقرہ میں تعمیر کعبہ کے وقت دعائے ابراہیمؑ کی حکایت کرتے ہوئے یہ ارشاد ہے کہ:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ (بقرہ۔ آیت ۱۲۸)

اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیو اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بنائے رکھیو۔

۳۰؎ سورۂ نساء (آیت ۔ ۱۲۵) اور سورۂ جن (آیت ۱۴) میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

۳۱؎ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران (آیت ۲۰)، سورۂ نحل (آیت ۴۴)

اسی طرح حضرت ابراہیم ویعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں سے جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کا عہد لیا تو انہوں نے فوراً اقرار کیا کہ :

وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ (بقرہ۔ آیت ۱۳۳) اور ہم اس کے تابع فرمان ہیں۔[۳۲]

یا مثلاً سورۂ نور میں ہے کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا (نور : ۲۷)

مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے (لوگوں کے) گھروں میں گھر والوں سے اجازت لیے بغیر اور سلام کیے بغیر داخل نہ ہوا کرو۔

یہاں سَلَّمَ کا صلہ علیٰ آیا ہے۔ لہٰذا یہاں سلام وتحیۃ ہی کے معنی ہونگے۔

اب رہے وہ مواقع جہاں بغیر کسی صلہ کے اس لفظ کا استعمال ہوا ہے تو ان جگہوں پر سیاق وسباق کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے، ذیل میں اس کی چند مثالیں دی جا رہی ہیں :

اطاعت کے معنی میں | قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ شیطان کی پیروی یا اطاعت نہ کریں بلکہ ہر معاملہ میں صرف خدائے واحد ہی کا حکم مانیں۔ چنانچہ ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۔ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۔ (بقرہ ۲۰۸)

مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو۔ وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

یہاں سِلْم کے معنی اگرچہ سلامتی کے بھی بعض مفسرین نے لیے ہیں لیکن شیطان کے اتباع کے مقابلہ میں اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کے معنی اختیار کرنا انسب ہیں۔[۳۳]

۳۲۔ آیاتِ ذیل میں بھی "مُسْلِمُوْنَ" ان ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے: آل عمران ۵۲۔ ۸۵۔ عنکبوت: ۴۶۔ انبیاء: ۱۰۸

۳۳۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر

ایک جگہ ارشاد ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (نساء - آیت ۶۵)

پس قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ مومن نہ ہونگے جبتک اپنے آپس کے جھگڑوں میں تم کو حکم نہ مان لیں، پھر اس پر اپنے دلوں میں کبھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ پورا پورا تسلیم کر لیں۔

سورۂ مائدہ میں انبیاء کرام علیہم السلام کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا اتباع اور اس کی اطاعت کرنے والے ہیں:-

اَلنَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا (آیت ۴۴)

انبیاء جو خدا کے فرمانبردار تھے[۳۴]

ایک جگہ فرمایا:

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ (صافات - ۱۰۳)

جب دونوں نے حکم مان لیا اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا دیا۔

سورۂ نحل میں ہے:

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِن سُوءٍ (النحل - ۲۸)

جب فرشتے اُن لوگوں کی رُوحیں قبض کرنے لگتے ہیں جو اپنے حق میں ظلم کرنے والے تھے تو وہ سر اطاعت جھکا دیتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم کوئی بُرا کام نہیں کرتے تھے

آگے ارشاد ہے:

كَذَٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ۔ (النحل: ۸۱)

اسی طرح خدا اپنا احسان تم پر پورا کرتا ہے کہ تم فرمانبردار بنو۔

سورۂ حج میں اپنی اُلوہیت کے حق کے طور پر یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے:

فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا

پس تمہارا معبود ایک ہی ہے لہٰذا اسی کے فرمانبردار

---

[۳۴] مزید دیکھیے آل عمران آیت ۲۰ - حجرات آیت ۱۷

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ (آیت ۳۴) ہو جاؤ اور آپ عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دو۔ [۳۵]

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ملکہ سبا کے نام اپنے مکتوب گرامی میں یہ مطالبہ کیا تھا:-

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ — مجھ سے سرکشی نہ کرو اور مطیع و منقاد ہو کر میرے

(النمل آیت ۳۱) پاس چلے آؤ۔ [۳۶]

اسی سلسلہ کلام میں آگے اپنے درباریوں سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِهَا — اے درباریو! کوئی تم میں سے ایسا ہے کہ قبل اس کے

قَبْلَ اَنْ یَّاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ - (نمل: ۳۸) — کہ وہ لوگ فرمانبردار ہو کر ہمارے پاس آئیں ملکہ کا تخت میرے پاس لے آئے

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ (قلم: ۳۵) — کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کی طرح (نعمتوں سے محروم) کر دیں گے؟

حضرت یوسف اپنے پروردگار سے اس طرح دعا کرتے ہیں:

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔ — اے (فاطر السموٰت والارض) تو مجھے دنیا سے فرمانبردار اٹھائیو

(یوسف: ۱۰۱) — اور (آخرت میں) اپنے نیک بندوں میں داخل کیجیو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم نے تصریح کی ہے کہ وہ نہ تو یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ:

وَلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا - (آل عمران: ۶۷) — سب سے بے تعلق ہو کر ایک خدا کے ہو رہے تھے۔ اور اسی کے فرمانبردار تھے

آخرت میں کفار کا یہ حال ہوگا کہ:- بَلْ هُمُ الْیَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ (صافات: ۲۶) بلکہ آج تو فرمانبردار بنے جا رہے ہیں۔

صلح کے معنی میں | دوسرے معنی یعنی صلح کے سلسلے میں چند مثالیں درج ذیل ہیں:-

فَاِنِ اعْتَزَلُوْکُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ وَاَلْقَوْا — پھر اگر وہ (کافر) تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور تمہارے

اِلَیْکُمُ السَّلَمَ ... (نساء: ۹۰) — خلاف جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح (کا پیغام) بھیجیں

اسی سورۃ کی اگلی آیت میں بھی لفظ سلم صلح کے معنی میں استعمال ہوا ہے [۳۷]۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَی السَّلْمِ (محمد-۳۵) "تو تم ہمت نہ ہارو اور دشمنوں کو صلح کی طرف بلاؤ۔

---

۳۵ مزید ملاحظہ ہو: سورۂ زمر: ۵۴) وانیبوا الی ربکم واسلموا۔ ۳۶ یہاں انقیاد و اطاعت بھی مراد ہے اور صلح بھی۔ ۳۷ ملاحظہ ہو:- ویلقوا الیکم السلم (نساء: ۹۱)

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۔ (انفال: ۶۱)
اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور خدا پر بھروسہ رکھو۔

دوسرے معانی میں | اطاعت اور صلح کے علاوہ دوسرے چند مختلف معانی میں استعمالات کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ۔ (انفال ۔۴۳)
اور اگر اللہ تمہیں دشمنوں کو زیادہ کر کے دکھاتا تو تم لوگ جی چھوڑ دیتے اور (جو) کام در پیش تھا اس میں جھگڑنے لگتے لیکن خدا نے تمہیں اس سے بچا لیا۔

اَلْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ (حشر:۲۳)
بادشاہ، پاک، بے عیب، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست، بڑائی و عظمت والا۔

وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ (طٰہٰ۔۴۷)
اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کا اتباع کرے۔

بنی اسرائیل نے ذبحِ بقر کا حکم ملنے کے بعد جو ردّ و قدح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شروع کی تھی اور گائے کی شکل و صورت وغیرہ سے متعلق استفسارات کیے تھے ان کے جواب میں جس گائے کی نشاندہی کی گئی اسے قرآن میں بیان کرتے ہوئے یہ فقرہ بھی ارشاد ہوا ہے:

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا (بقرہ۔۷۱)
بے عیب جس میں کوئی داغ دھبہ نہ ہو (یعنی وہ گائے جسمانی نقائص سے پاک ہونی چاہیے)

سورۂ ہود میں ہے:۔

قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا۔ (ہود۔۴۸)
حکم ہوا کہ اے نوحؑ ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اتر آؤ۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف خلوصِ نیت سے رجوع کرے اور اپنے دل کو خواہشات وغیرہ سے پاک و محفوظ رکھے تو وہ بلاشبہ قابلِ تحسین ہے۔ سورۂ شعراء میں ہے:۔

إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (شعراء: ۸۹) "ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک

دل[۳۸] لے کر آیا۔

إِذْ جَآءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ

جب وہ (ابراہیمؑ) اپنے پروردگار کے پاس پاک دل لے کر آئے۔

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا۔ (فرقان: ۶۳)

(اور خدا کے بندے تو وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور) جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام[۳۹] کہتے ہیں (یعنی ان کو سلام کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں)

أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ۔ (طور: ۲۹)

کیا ان (کفار) کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر (چڑھ کر یہ آسمان سے باتیں) سن آتے ہیں[۴۰]۔

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا (واقعہ ۲۵، ۲۶)

وہاں (جنت میں) نہ بیہودہ بات سنیں گے اور نہ گالی گلوچ۔ ہاں ان کا کلام سلام سلام[۴۱] (ہوگا)

سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبٍّ رَحِيمٍ (یٰس-۵۸)

پروردگار مہربان کی طرف سے سلام (کہا جائے گا)

---

۳۹ صاحب لسان العرب نے یہاں سلام سے مراد براءۃ اور قطع تعلق لیا ہے (معناہ تسلما وبراءۃ لا خیر بیننا وبینکم ولا شر۔ لسان العرب ج ۱۰)

۴۰ سیڑھی چونکہ آدمی کو سلامتی کے ساتھ بلندی پر پہنچا دیتی ہے اس لیے اس کو سُلَّم کہتے ہیں۔

۴۱ مطلب یہ ہے کہ امن و آشتی کی باتیں ہونگی فساد و منافقت کی نہ ہونگی۔

رسائل و مسائل

درایتِ حدیث

سوال - آپ نے سورۂ ص کی تفسیر میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق روایت ابو ہریرہؓ کی سند کو درست قرار دیا ہے مگر اس کے مضمون کو صریح عقل کے خلاف قرار دے کر مسترد کر دیا ہے۔ آپ کے مخالفین اس چیز کو آپ کے انکارِ سنت پر بطور دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ آپ عقل کی آڑ لے کر صحیح احادیث کا انکار کر دیتے ہیں۔ آپ اپنی اس رائے کو بدل دیں یا پھر اس پر کوئی نقلی دلیل آپ کے پاس ہو تو وہ تحریر فرمائیں۔ اگر ائمۂ اسلاف میں سے کسی نے یہ بات کہی ہے تو اس کا حوالہ تحریر فرمائیں۔

اگر کسی امام نے کسی حدیث کی سند کو درست تسلیم کر کے اس کے مضمون کو صرف خلافِ عقل ہونے کی بنا پر مسترد کیا ہو تو اس کا حوالہ تحریر فرمائیں۔

مکرر عرض ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک رات میں نوے ۹۰ بیویوں کے پاس گئے تو اس سے کونسی شرعی قباحت لازم آتی ہے۔ کیا آپ بھی جدید مغرب زدہ طبقہ سے مرعوب تو نہیں ہو رہے ہیں؟

جواب - براہِ کرم اسی حاشیے کو پھر بغور پڑھ لیں جس پر آپ نے اظہارِ رائے کیا ہے اسی میں اس امر کی دلیل موجود ہے کہ صحتِ سند کے باوجود اس حدیث کا مضمون کیوں ناقابلِ قبول ہے۔ اور اسی میں یہ بات بھی میں نے بیان کر دی ہے کہ اس امر کا قوی احتمال موجود ہے کہ غالباً حضورؐ نے یہودیوں کی خرافات کا ذکر کیا ہوگا اور سامع کو یا بعد کے کسی راوی کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی ہوگی کہ یہ بات حضور خود بطورِ واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ کیا ائمہ سلف میں سے بھی کسی نے کسی حدیث کی سند کے صحیح ہونے کے باوجود اس کے مضمون کو قبول نہیں کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ زاد المعاد میں علامہ ابن قیم حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کردہ حدیث "من عشق فعف فمات فھو شہید" وفی روایۃ "من عشق وکتم وعف وصبر غفر اللہ لہ و ادخلہ الجنۃ" پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں: لو کان اسناد ھذا الحدیث کالشمس کان غلطا و وھما" اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح روشن ہوتی تب بھی یہ غلط اور وہم ہوتی"۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کا مضمون صحیح نہیں ہے اور یہ زبان بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں معلوم ہوتی (زاد المعاد، ج ۳-ص ۲۰۶-۲۰۷)

الاستیعاب میں علامہ ابن عبدالبر ایک روایت نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں ان حدیث ابن عمر وھم وغلط وانہ لا یصح معناہ وان کان اسنادہ صحیحاً" ابن عمرو کی حدیث وہم ہے اور غلط ہے، اس کا مضمون صحیح نہیں ہے اگرچہ اس کی سند صحیح ہے"۔ (جلد دوم صفحہ ۴۶۶)

یہ بات کچھ بعید از عقل و امکان نہیں ہے کہ ایک شخص نے ایک بات واقعی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو مگر اس کو پوری طرح نہ سمجھا ہو، یا موقع و محل پر نگاہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کو غلط فہمی لاحق ہوگئی ہو۔ بخاری و مسلم ہی میں یہ واقعہ موجود ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر حضورؐ کا یہ ارشاد نقل فرماتے تھے کہ "انّ المیّت یُعذّب ببکاء اھلہٖ" "میت پر اس کے گھر والوں کے رونے پیٹنے سے عذاب ہوتا ہے"۔ یہ بات حضرت عائشہ تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا اللہ ابن عمر کو معاف فرمائے، وہ جھوٹ نہیں بولتے، مگر انہیں بھول ہوگئی یا وہ سمجھنے میں غلطی کر گئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ ایک یہودی عورت کے مرنے پر اس کے گھر والے رو رہے تھے۔ حضورؐ کا وہاں سے گزر ہوا تو آپ نے فرمایا یہ یہاں اس پر رو رہے ہیں اور وہ اپنی قبر میں عذاب بھگت رہی ہے۔

اسی لیے حدیث کی سند دیکھنے کے ساتھ اس کے مضمون پر بھی غور کرنا ضروری ہے محض سند کی صحت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ حدیث کا مضمون لازماً جُوں کا توں قبول کر لیا جائے خواہ اس میں

علانیہ کوئی قباحت نظر آتی ہو۔

آپ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمانؑ ایک رات میں نوے بیویوں کے پاس گئے تو اس سے کونسی شرعی قباحت لازم آتی ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اس میں شرعی قباحت نہیں بلکہ عقلی قباحت ہے اور عملاً ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ میں نے تو حساب لگا کر بتا دیا ہے کہ ۹۰ نہیں۔ ۶۰ بیویاں ہی اگر مان لی جائیں تو لازم آتا ہے کہ دس گھنٹوں تک مسلسل ہر دس منٹ میں ایک بیوی کے پاس حضرت سلیمان جاتے اور اس سے مباشرت کر کے فارغ ہوتے چلے گئے۔ کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ ایک انسان دس گھنٹوں تک مسلسل ہر دس منٹ پر مباشرت سے فارغ ہوتا رہے اور فوراً وہ دوسری مباشرت کے لیے تیار ہو جاتے؟ اور بالفرض اگر حضرت سلیمانؑ کی یہ حالت تھی بھی تو کیا تمام بیویاں ایسی تیار بیٹھی ہوئی تھیں کہ ایک بیوی سے فارغ ہوتے ہی حضرت دوسری بیوی کے پاس جاتے ہی فوراً مباشرت میں مشغول ہو جاتے رہے؟ اس طرح کی باتوں کو آپ ماننا چاہیں تو بخوشی مانتے رہیں، مگر یاد رکھیے کہ روایات پر ایسا ہی غلط اصرار فتنۂ انکار حدیث کو ہوا دے رہا ہے۔

(بقیہ اشارات)

اب ذرا ایک نگاہ حضور سرورِ دو عالم کے اُن ارشادات پر بھی ڈال لیں جو حضورؐ نے مسلمانوں کی جان و مال، اور عزت و آبرو کے معاملہ میں مختلف مواقع پر فرمائے ہیں۔ رحمۃ للعالمین نے مسلمان کی صفات بیان کرتے ہوئے اس کی ایک اہم صفت یہ بیان فرمائی ہے:

عن عبد اللّٰہ ابن عمرؓ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہٖ۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

اسی طرح صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے یہی حدیث ایک آدھ لفظ کے تغیر کے ساتھ یوں درج ہے:

قال قلت یا رسول اللہ ای الاسلام اَفضَلُ قال من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ - (کتاب الایمان)

(ابوموسیٰ اشعری) نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کس شخص کا اسلام بہتر ہے؟ فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں

مسلمان کے خلاف صف آرا ہونے کو ایک دوسرے مقام پر کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

عن عبد اللہ ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر (صحیح مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر۔

حضور سرور دو عالمؐ نے مسلمانوں کو بڑی تاکید کے ساتھ مسلمان کی جان کے بارے میں وصیت فرمائی اور قتلِ مسلم کو کفر اور ارتداد جیسا گھناؤنا فعل قرار دیا:

عن ابن عباس قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا ترتدّوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض - (بخاری کتاب الفتن)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بعد پلٹ کر کافر بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

اسی ضمن میں ذرا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر بھی غور کر لیجیے جو حضورؐ نے بڑی دلسوزی اور سخت تاکید کے ساتھ حجۃ الوداع کے تاریخی خطبے میں فرمایا تھا۔

عن ابی بکرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطب الناس فقال الا تدرون ای یوم ھذا؟ قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال حتی ظننّا انہ سیسمیہ بغیر اسمہ فقال الیس بیوم النحر۔ قلنا بلیٰ یا رسول اللہ قال ای بلدٍ ھذا الیست بالبلدۃ قلنا بلیٰ یا رسول اللہ قال فان دمائکم واموالکم واعراضکم وابشارکم

حضرت ابوبکرۃؓ سے روایت ہے کہ حضور سرور کائنات نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا جانتے ہو یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول سب سے بہتر جانتے ہیں (ابوبکرہ کہتے ہیں آپ اتنی دیر خاموش رہے کہ ہم خیال کرنے لگے کہ شاید آپ اس دن کا کچھ اور نام رکھنے والے ہیں پھر حضورؐ نے فرمایا: کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ہاں آج بیشک یوم النحر ہے پھر آپ نے فرمایا:

علیکم حرام کحرمة یومکم ھذا فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا الا ھل بلغت قلنا نعم۔ قال اللھم اشھد فلیبلغ الشاھد الغائب (بخاری کتاب الفتن)	اچھا یہ شہر کونسا ہے؟ کیا یہ حرمت والا شہر (مکہ) نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا بیشک یا رسول اللہ یہ حرمت والا شہر مکہ ہی ہے تب آپؐ نے فرمایا: دیکھو تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری عزت و آبرو اور تمہارے جسموں کی کھالیں ایک

دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسے اس دن کی حرمت اس مہینے اور اس شہر میں۔ سنو، میں نے اللہ کا حکم تم کو پہنچا دیا یا نہیں؟ ہم نے کہا: بے شک آپ نے پہنچا دیا۔ اس وقت آپ نے دعا کی اے اللہ گواہ رہیو اور فرمایا جو لوگ یہاں موجود ہیں میرا یہ کہنا اُن لوگوں تک پہنچا دیں جو موجود نہیں۔

حضور سرورِ کائنات نے ایک اور حدیث میں مسلمانوں پر ہاتھ اٹھانے والوں کو امّتِ محمدیہ کے دائرہ سے خارج قرار دیا ہے:

عن ابن عمر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من حمل علینا السلاح فلیس منا (مسلم)	حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں

جو شخص ایک مرتبہ زبان سے کلمۂ شہادت ادا کر دے، خواہ وہ خوف کی وجہ سے ہی ایسا کر رہا ہو، اس کے قتل کو بھی اسلام نے گناہِ عظیم قرار دیا ہے۔ حضرت مقداد بن اسود کی روایت ہے:

"انہوں نے کہا یا رسولؐ اللہ! اگر میری کافر سے مٹھ بھیڑ ہو جائے اور وہ مجھ پر حملہ کر کے میرا ایک ہاتھ تلوار سے کاٹ دے، پھر مجھ سے بچ کر ایک درخت کی اوٹ میں پناہ لے لے اور کہے کہ میں ایمان لے آیا۔ کیا میں اس حالت میں اُسے قتل کر دوں؟ اس پر حضورؐ نے فرمایا اسے مت قتل کرو۔ میں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی: یا رسول اللہ اُس نے میرا ہاتھ کاٹ دیا ہے اور اس کے بعد ایمان کا اظہار کرتا ہے۔ حضورؐ نے پھر فرمایا: مت قتل کرو اس کو (اگرچہ تجھ کو اس سے صدمہ پہنچا اور زخم لگا)۔ اگر تو اُسے قتل کریگا تو اس کا وہی حال ہو گا جو اس جرم کے ارتکاب سے پہلے تیرا حال تھا اور تیرا حال وہ ہو گا جو اس کا حال یہ کلمہ ادا کرنے سے پہلے تھا۔" (صحیح مسلم)

مسلم کے نامور شارح امام نوویؒ نے اس حدیث کے مطلب میں علماء کے اختلاف کو نقل کرنے کے بعد

امام شافعیؒ اور ابن قصار المالکی کا یہ قول درج کیا ہے: فانه معصوم الدم محرم قتله بعد قوله لا اله الا الله کما کنت انت قبل ان تقتله وانك بعد قتله غیر معصوم الدم ولا محرم القتل کما کان ھو قبل قوله لا اله الا الله (نووی شرح مسلم جلد اول ص۶۹) "حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تو اس کا خون ویسا ہی معصوم اور اس کا قتل ویسا ہی حرام ہو گیا جیسا تیرا خون اور تیرا قتل اسے قتل کرنے سے پہلے تھا اور تو اسے قتل کرنے کے بعد ویسا ہی ہو گیا جیسا وہ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے پہلے تھا یعنی نہ تیرا خون معصوم اور نہ تیرا قتل حرام"

اسی طرح ایک دوسری حدیث جو حضرت اُسامہ بن زیدؓ سے مروی ہے اُس میں بھی حضور سرورِ دو عالم نے کلمہ شہادت زبان سے ادا کرنے والے کو قتل کرنے سے بڑے سخت الفاظ میں منع فرمایا ہے:

"حضرت اسامہ بن زیدؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ سرور کائنات نے ہمیں ایک جنگی مہم پر بھیجا۔ ہم حرقات کے ایک قبیلہ جُہینہ سے نبرد آزما ہوئے ہم نے وہاں ایک شخص کو گرفتار کر لیا۔ اُس نے فوراً لا الٰہ الا اللہ کہا لیکن میں نے برچھی سے اُس کو مار دیا۔ اس کے بعد میرے دل میں اس فعل پر ایک خلش پیدا ہوئی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا "کیا اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا تھا اور تم نے اسے مار ڈالا؟" میں نے عرض کیا "اُس نے ہتھیار کے خوف سے یہ الفاظ کہے تھے" اس پر حضورؐ نے فرمایا: اَفلا شققت عن قلبه حتی تعلم اقالها ام لا؟ کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا تاکہ تجھے معلوم ہو تا کہ اس کے دل نے یہ کلمہ کہا تھا کہ نہیں"۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ کا کہنا ہے کہ حضورؐ یہ کلمات بار بار دُہراتے رہے یہاں تک کہ میں نے آرزو کی کاش میں نے اُسی دن اسلام قبول کیا ہوتا"۔ اسی حدیث کی ایک دوسری روایت تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ جو منقول ہوئی ہے اس کے آخر میں حضورؐ کے الفاظ ایسے ہیں جن سے اُسامہ کے اس فعل پر آپؐ کے شدید اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضورؐ نے جب اُسامہؓ سے اس واقعہ کے بارے میں دریافت فرمایا تو حضرت اُسامہؓ نے کہا: یا رسول اللہ اس نے مسلمانوں کو شدید اذیت دے رکھی تھی اور فلاں فلاں کو شہید کر دیا تھا"۔ اس کی صراحت میں حضرت اسامہؓ نے چند افراد کے نام بھی لیے، پھر کہا، لیکن جب میں اس پر غالب آیا تو اس نے تلوار کے ڈر سے لا الٰہ الا اللہ کہنا شروع کر دیا؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، کیا تو نے پھر بھی اُسے قتل کر دیا؟ انہوں نے کہا "ہاں" اس پر رسالتمآبؐ نے فرمایا: فکیف تصنع

بلا الٰہ الا اللہ اذا جاءت یوم القیامۃ" تو لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دیگا جب وہ قیامت کے دن پیش ہوگا؟" حضرت اسامہؓ نے عرض کیا "حضورؐ میرے لیے بخشش کی دعا فرمائیں" لیکن آپ بار بار یہی بات دہراتے کہ "کیا جواب دیگا تو لا الٰہ الا اللہ کا جب وہ آئیگا قیامت کے دن" (صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب تحریم قتل الکافر بعد قولہ لا الٰہ الا اللہ)

قتلِ مومن تو خیر بڑا سنگین جرم ہے۔ حضور سرورِ دو عالمؐ نے تو اُس شخص کو بھی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے جو کسی مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے۔ عن ابی ھریرۃ قال ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم من اشار الی اخیہ بحدید فان الملئکۃ تلعنہ حتی یدعہ وان کان اخاہ لابیہ وامہ (صحیح مسلم۔ کتاب البر والصلۃ والآداب) "حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور سرورِ دو عالمؐ نے فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی کی طرف لوہے سے (یعنی ہتھیار سے) اشارہ کرے اس پر فرشتے لعنت کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس سے باز آجائے۔ خواہ وہ اس کا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔

حضور سرورِ کائنات نے مسلمانوں کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ وہ تیروں اور نیزوں کو لیکر یونہی بازاروں، مساجد یا اجتماعی زندگی کے دوسرے مراکز میں آجائیں۔ انہیں اس ضمن میں اس بات کی سخت ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ان کے ضرر رساں حصّوں کو پوری طرح ڈھانک کر رکھیں تاکہ اُن سے کسی کو غفلت میں بھی کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ یہ حکم صرف تیر، نیزے یا تلوار پر ہی حاوی نہیں بلکہ اس کے تحت ہر وہ ہتھیار یا چیز آجاتی ہے جس سے ضرر پہنچنے کا کوئی احتمال موجود ہو۔ (ملاحظہ ہو صحیح مسلم۔ باب من مر بسلاح فی مسجد او سوق ... شرح نووی جلد دوم ص ۳۲۸)

حضور سرورِ کائنات کے ارشاداتِ گرامی اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ قیامت کے روز ایک شخص جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوگا تو اُس سے پہلا سوال انسانی خون کے بارے میں ہی کیا جائیگا۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ نے حضورؐ کا فرمان یوں روایت کیا ہے: اول ما یقضی بین الناس یوم القیامۃ فی الدماء (صحیح مسلم) "قیامت کے روز لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خون کے مقدمات کا فیصلہ کیا جائے گا۔" امام نوویؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ جرم بڑا سنگین ہے اس لیے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اسی کے بارے میں قیامت کے روز باز پرس کریگا۔ اس حدیث کا اس حدیث سے کوئی تعارض نہیں ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے نماز کے بارے میں سوال کیا جائیگا۔ حقوق اللہ میں سے نماز اولین اہمیت کی حامل ہے، اور حقوق العباد میں انسانی جان کا احترام بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ (جلد دوم ص...)

جو بدبخت انسانی جان کے درپے ہوتے ہیں انہیں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ اور اُس کے رسول

کی تعلیمات کے مطابق اُن پر صرف اُس خونِ ناحق کا وبال ہی نہیں پڑتا جو انہوں نے خود گرایا ہے۔ بلکہ ان کے جرم کے ارتکاب کے بعد جو دوسرے لوگ اس کے جواب میں یا ان کی بری مثال سے متاثر ہو کر یا ان کی پیدا کردہ بدامنی کی وجہ سے جری ہو کر انسانی جانوں سے کھیلیں گے، اُن کے وبال کا ایک حصہ بھی ان کے نامۂ سیاہ میں اُسی طرح لکھا جائیگا جس طرح کہ قاتلِ اوّل قابیل کے نامۂ اعمال میں درج ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی دراز دستیوں کی وجہ سے معاشرے میں جور و ستم کے دروازے کھولتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (جس نے کسی انسان کو خون کے قصاص یا زمین میں فساد پھیلانے کی سزا کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا) یعنی جو ظالم و فاجر ایک شخص کی جان بلا وجہ اور بے قصور لے ڈالنے میں نہیں جھجکتا اُس کی جسارت اور خبثِ نفس سے اوّل تو یہ بعید نہیں کہ اُسے اگر موقع میسر آئے تو وہ پوری نوعِ انسانی کو تہ تیغ کر دے۔ لیکن کم از کم اس کے اس فعل کا یہ نتیجہ تو رونما ہو کر ہی رہتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے لیے قتلِ نفس کا دروازہ کھلتا ہے اور تمام انسانوں کی جان کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے جو شخص اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت ایک انسان کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا دشمن ہے۔ اسی حقیقت کو حضور سرورِ دو عالم نے حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے:

عن عبد الله قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم لا تقتل نفس ظلمًا الا كان على ابن آدم الاول كفل من دمها لانه كان اول من سن القتل۔ (صحیح مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب روئے زمین پر کوئی خونِ ناحق ہوتا ہے تو اس کا ایک حصہ آدم کے پہلے بیٹے (قابیل) کے ذمہ پڑتا ہے کیونکہ اس نے قتل کی راہ نکالی

اللہ اور اس کے رسول کے یہ احکام مسلمانوں کو یاد نہیں رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ذرا ذرا سی باتوں پر مسلمان کے ہاتھ سے مسلمان کا قتل بے دھڑک ہو رہا ہے، اور کم ہی کسی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ کیسا جرمِ عظیم ہے جس کا مظلمہ وہ اپنی گردن پر لے رہا ہے۔ آج اگر ہم اس کی روک تھام کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ ان احکام کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچائیں، شاید کہ بھولے ہوئے سبق کو یاد کر کے دل اس سے ڈریں اور ہاتھ اس سے رک جائیں۔

اِصلاح وتربیّت کیلئے بے مثل کُتب

راہِ عمل
تالیف:۔ مولانا جلیل احسن ندوی

- مستند احادیثِ نبوی کا ایسا مختصر مجموعہ جو ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی میں رہنمائی کرے۔
- تعمیرِ سیرت کے لئے ایک بیش بہا خزینہ۔
- آفسٹ کی حسین طباعت۔ خوبصورت سرورق
- صفحات ۴۵۶ ہدیہ ۶٫۰۰ روپئے

اذکارِ مسنونہ
تالیف:۔ علامہ حافظ ابن قیمؒ

ترجمہ وحواشی:۔ مولانا خلیل احمد حامدی

- اس کتاب میں آپ کو اُٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے، سفر وحضر خلوت وجلوت ہر موقع کیلئے مسنون دعائیں ملیں گی۔
- بارگاہِ الٰہی میں مستجاب، جامع، پُراثر اور دل گداز دعاؤں کا مجموعہ۔
- آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت
- قسم اعلیٰ ۴٫۰۰ روپئے سستا ۲٫۵۰ روپئے

مسلمان کے روز و شب
از:۔ اسعد گیلانی

- ایک مسلمان کی زندگی کے لئے مفصل لائحہ عمل۔
- پاکیزہ زندگی گذارنے کیلئے ایک بیش قیمت کتاب۔
- صحابہ کرام اور صلحاء امت کی پاکیزہ زندگیوں کا عکس۔
- مسنون دعائیں اور عبادات۔
- قیمت صرف ۳٫۲۵ روپئے

دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات
از:۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مولانا امین احسن اصلاحی۔ میاں طفیل محمد

- دعوتِ اسلامی اور اس کے تقاضے۔
- مسلمانوں کی موجودہ حالت کا تجزیہ
- اقامتِ صلوٰۃ کی غرض وغایت اور اہمیت
- دعوتِ اسلامی میں خواتین کا حصہ
- صفحات ۲۰۰۔ آفسٹ کی حسین طباعت
- قیمت ۳٫۰۰ روپئے

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں
از:۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- الٰہ ○ رب ○ عبادت ○ دین
- قرآن کی ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم اور ان کا انقلابی پہلو۔
- قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے ایک ناگزیر کتاب۔

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۲٫۲۵ روپئے سستا ایڈیشن ۱٫۲۵ روپیہ

اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر
از:۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- عبادت کا جاہلی اور اسلامی تصور۔
- اسلام میں عبادت کا حقیقی مقام۔
- انسانی زندگی پر عبادات کا اثر۔
- دین کا شعور حاصل کرنے کیلئے ایک بیش قیمت کتاب
- آفسٹ کی معیاری کتابت وطباعت
- قیمت ۱٫۷۵ روپیہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰
اد...
منصو...

عمرانی مسائل پر چند بلند پایہ کتب

سُود

از:۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- حرمت سود پر مفصل بحث۔
- جدید بینکنگ اور تجارتی قرضوں کے متعلق اسلامی احکام
- اسلام کے معاشی نظریہ پر بلند پایہ کتاب۔

قیمت قسم اعلیٰ ۔ ۵/۵۰ روپے سستا ایڈیشن ۳/۲۵ روپے

اسلام کا نظامِ عدل

از:۔ استاذ سید قطب (مصر)

ترجمہ:۔ محمد نجات اللہ صدیقی ایم۔ اے

- ایک ایسی کتاب جس نے عرب، یورپ اور امریکہ میں دھوم مچادی جس کو عربی، انگریزی اور فرنچ کے بعد اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔
- اسلام کے نظام عدل اجتماعی پر ایک معرکہ آرا کتاب۔
- قیمت ۱۰/۰۰ روپئے

رسائل و مسائل حصہ اوّل

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- زندگی کے بدلے ہوئے حالات میں اسلام کیا رہنمائی کرتا ہے۔
- زندگی کے ہر موڑ پر ایک راہ نما کتاب۔
- نئے حالات میں اسلامی احکام کا صحیح ترین انطباق۔
- قیمت ۶/۰۰ روپئے

اسلام اور جدید معاشی نظریات

از:۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- موجودہ عمرانی اور معاشی مسائل کا تاریخی پس منظر
- جدید سرمایہ داری۔ سوشلزم اور کمیونزم کا تجزیہ۔ اسلامی نظام معیشت کے بنیادی ارکان۔
- جدید معاشی پیچیدگیوں کا اسلامی حل۔
- قیمت:۔ ۲/۲۵ روپئے

انسان اور اس کے مسائل

از:۔ مولانا جلال الدین انصر عمری

- ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کیا ہیں۔
- انسانی مسائل کو اسلام کس طرح حل کرتا ہے؟
- ان اہم موضوعات پر مفصل بحث

عمدہ کتابت و طباعت ۔ قیمت ۱/۶۰ روپیہ

تنقیحات

از:۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم سے پیدا شدہ مسائل پر بصیرت افروز تبصرہ۔
- ملت اسلامیہ کے زوال و انحطاط کے اسباب کا بے لاگ جائزہ
- مغربی تہذیب پر بھرپور تبصرہ۔

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴/۵۰ روپے سستا ایڈیشن ۳/۲۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔